سورۃ الاسراء

آیاتہا ۱۱۱ ۔ ۱۷ سورۃ بنی اسرائیل مکیۃ ۵۰ ۔ رکوعاتہا ۱۲

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

یہ سورت مکی ہے سوائے تین آیات کے (اور وہ یہ ہیں) قول باری تعالیٰ: وَاِنۡ كَادُوۡا لَيَسۡتَفِزُّوۡنَكَ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب ثقیف کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، اور اس وقت یہودیوں نے کہا: یہ انبیاء علیہم السلام کی زمین نہیں ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَقُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِىۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِىۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ اور ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ الآیہ۔ اور مقاتل نے کہا ہے: اور یہ قول باری تعالیٰ بھی: اِنَّ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ مِنۡ قَبۡلِهٖۤ الآیہ۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف اور سورۂ مریم کے بارے میں کہا ہے: بے شک یہ عتاق اول میں سے ہیں، اور یہ میری پرانی کمائی میں سے ہیں (1)۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

سُبۡحٰنَ الَّذِىۡۤ اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ لَيۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ اِلَى الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِىۡ بٰرَكۡنَا حَوۡلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنۡ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ①

"(ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک بابرکت بنا دیا ہم نے جس کے گرد و نواح کو تا کہ ہم دکھائیں اپنے بندے کو اپنی قدرت کی نشانیاں، بے شک وہی ہے سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا۔"

اس میں آٹھ مسائل ہیں: (☆)

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: سُبۡحٰنَ۔ سبحان اسم ہے جو مصدر کی جگہ رکھا گیا ہے، اور یہ غیر متمکن ہے، کیونکہ اس میں وجوہ اعراب جاری نہیں ہو سکتیں، اور نہ اس پر الف لام داخل ہو سکتا ہے، اور نہ اس سے فعل آتا ہے، اور یہ غیر منصرف ہے کیونکہ اس کے آخر میں الف نون زائدتان ہے، تو کہتا ہے: سبّحتُ تسبیحا و سُبحانا، جیسا کہ کفرتُ الیمین تکفیرا و کفرانا ہے۔ اور اس کا معنی ہے التنزیہ والبرأۃ للّٰہ عزوجل من کل نقص (ہر نقص سے اللہ تعالیٰ کی برأت اور پاکی بیان کرنا ہے)۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر عظیم ہے اس کے سوا کوئی اور اس کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اور رہا شاعر کا یہ قول:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 434

☆ نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے تاہم مسائل چھ ہیں۔ مترجم

أقول لمّا جاءني فخرُه　　سُبحانَ مِنْ عَلْقَمَةَ الفاخِرِ (1)

تو بلاشبہ شاعر نے یہ بطریق نادر ذکر کیا ہے۔ اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ الفیاض رضی اللہ عنہ جو کہ اصحاب عشرہ میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: سبحان اللہ کا معنی کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تنزیه الله من كل سُوءٍ (2) (اللہ تعالیٰ کو ہر کمزوری اور نقص سے پاک قرار دینا)۔ سیبویہ کے مذہب کے مطابق اس میں عامل وہ فعل ہے جو اس کا ہم معنی ہو نہ کہ اس کے لفظوں سے ہو، جبکہ اس کے لفظ سے فعل آتا ہی نہیں، اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ قعد القُرفُصاء (وہ اپنے ہاتھوں کے ساتھ احتباء کی حالت میں بیٹھا) اور اشتمل الصَّمَّاء (وہ کپڑے میں مکمل طور پر لپٹ گیا) (دونوں مثالوں میں دونوں فعل ہم معنی ہیں) پس ان کے نزدیک تقدیر عبارت یہ ہے: أنزه الله تنزيها، تو ''سبحان الله'' آپ کے قول تنزیها کی جگہ واقع ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ۔ أسْرٰی میں دو لغتیں ہیں: سَرٰی اور أسرٰی، جیسا کہ سقی اور أسقی ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

أَسْرَتْ عليه من الجَوْزاء سارِيَةٌ　　تُزجِي الشَّمال عليه جامدَ البَرَد

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

حَيّ النَّضِيرة ربة الخِدْرِ　　أسْرَت إليّ ولم تكن تَسْرِي

دونوں شعروں میں دونوں لغتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ اور اسراء کا معنی رات کو چلنا ہے۔ کہا جاتا ہے: سَرَيت مَسْرًى وَسُرًى، اور أسريت إسراء۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

وليلة ذات ندىً سَرَيتُ　　ولم يَلِتْنِي من سُراها لَيْت (3)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: أسرٰی وہ رات کے پہلے حصہ میں چلا۔ اور سَرٰی وہ رات کے آخری حصہ میں چلا۔ پہلا قول زیادہ معروف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: بِعَبْدِهٖ علماء نے کہا ہے: اگر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اور اسم گرامی اس سے اشرف ہوتا تو یقیناً اس حالت علیا میں اللہ تعالیٰ آپ کا ذکر اس کے ساتھ فرماتا۔

اور اس معنی میں انہوں نے یہ شعر بیان کیے ہیں:

ياقومِ قلبي عند زهراءِ　　يعرفه السامعُ والرائي

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 223
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 435
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 224

لا تدعنی إلا بیا عبدھا فإنہ أشرف أسمائی (1)

اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی بارگاہ عالی کی طرف اٹھایا، اور آپ کو ستاروں کی بلندی سے بھی اوپر لے گیا، تو امت کے سامنے تواضع کے لئے آپ کا ذکر اسم عبودیت کے ساتھ فرمایا۔

مسئلہ نمبر 4۔ تمام کتب حدیث میں اسراء ثابت ہے، اور جملہ اطراف اسلام میں یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کیا گیا ہے پس یہ اس وجہ سے متواتر اخبار میں سے ہے، اور نقاش نے اس سے ذکر کیا ہے جس نے اسے بیس صحابہ کرام سے روایت کیا ہے۔ اور صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پاس براق لایا گیا اور یہ سفید رنگ کا طویل جانور ہے جو گدھے سے بڑا ہے اور خچر سے ذرا کم ہے وہ اپنا پاؤں اپنی حد نظر پر رکھتا ہے...... فرمایا...... پس میں اس پر سوار ہوا یہاں تک کہ میں بیت المقدس میں آ گیا...... فرمایا...... پھر میں نے اسے اس حلقہ کے ساتھ باندھ دیا جس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام سواریاں باندھتے تھے...... فرمایا...... پھر میں مسجد میں داخل ہوا اور میں نے اس میں دو رکعتیں نماز پڑھی پھر میں (باہر) نکلا تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام میرے پاس ایک برتن میں شراب اور ایک برتن میں دودھ لے کر آئے تو میں نے دودھ کو پسند کیا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: آپ نے فطرت کو اختیار کیا ہے...... فرمایا...... پھر وہ ہمارے ساتھ آسمان کی طرف چڑھے...... (2)'' اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور ان روایات میں سے جو صحیحین میں نہیں ہیں وہ ہے جسے آجری اور سمرقندی نے ذکر کیا ہے، آجری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے اس قول باری تعالیٰ کے تحت ذکر کیا ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رات کے بارے بتایا جس میں آپ کو سفر معراج پر لے جایا گیا، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے پاس ایک جانور لایا گیا جو جانوروں میں سے خچر کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا تھا اس کے دونوں کان حرکت کر رہے تھے اور وہ وہی براق ہے جس پر اس سے قبل انبیاء علیہم السلام سواری کرتے تھے پس میں اس پر سوار ہوا اور وہ چل پڑا وہ اپنا قدم انتہا نگاہ پر رکھتا تھا پس میں نے اپنی دائیں جانب سے ایک آواز سنی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٹھہر جائیے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ دریافت کر لوں، پس میں چلتا رہا اور میں نے اس پر کوئی اعتماد نہ کیا (کوئی توجہ نہ دی) پھر میں نے اپنی بائیں جانب سے ایک ندا سنی: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ٹھہر جائیے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں، لیکن میں چلتا رہا اور میں نے اس پر کوئی اعتماد نہ کیا پھر میرے سامنے ایک عورت آئی جس پر دنیا کی ہر زینت و آرائش تھی وہ اپنا ہاتھ اٹھائے ہوئے کہہ رہی تھی ٹھہر جائیے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں، لیکن میں چلتا رہا اور میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ پھر میں بیت المقدس مسجد اقصیٰ آیا اور اس جانور سے اتر گیا اور میں نے اسے اسی حلقے سے باندھ دیا جس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام باندھتے تھے۔ بعد ازاں میں مسجد میں داخل ہوا اور اس میں نماز پڑھی تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مجھے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم نے کیا سنا ہے! تو میں نے کہا: میں نے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1192 2۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 387، حدیث 3184

اپنی دائیں جانب سے ایک آواز سنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر جائیے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں لیکن میں چلتا رہا اور اس پر اعتماد نہ کیا۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: وہ یہود کی دعوت دینے والا تھا۔ اگر آپ ٹھہر جاتے تو آپ کی امت یہودی ہو جاتی۔۔۔۔۔۔ فرمایا۔۔۔۔۔۔ پھر میں نے ایک ندا اپنی بائیں جانب سے سنی ہے ٹھہر جائیے یہاں تک کہ میں آپ سے کچھ پوچھ لوں لیکن میں چلتا رہا اور اس پر اعتماد نہ کیا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: وہ عیسائیت کی دعوت دینے والا تھا۔ بلاشبہ اگر آپ ٹھہر جاتے تو آپ کی امت عیسائی ہو جاتی۔۔۔۔۔۔ فرمایا۔۔۔۔۔۔ پھر میرے سامنے ایک عورت آئی اس پر دنیا کی ہر قسم کی زیب و زینت تھی وہ اپنے ہاتھ اٹھائے ہوئے کہہ رہی تھی ٹھہر جائیے لیکن میں چلتا رہا اور میں نے اس پر کوئی اعتماد نہ کیا۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: وہ دنیا تھی اگر آپ ٹھہر جاتے تو آپ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے۔ اور اسے پسند کرتے۔۔۔۔۔۔ فرمایا۔۔۔۔۔۔ پھر میرے پاس دو برتن لائے گئے ان میں سے ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب تھی، سو مجھے کہا گیا: پکڑو اور پیو جسے چاہو، تو میں نے دودھ لے لیا اور اسے پیا، تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مجھے کہا: آپ نے فطرت کو اپنا لیا ہے اور اگر آپ شراب لے لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ پھر وہ سیڑھی (معراج) لے کر آئے جس کے ساتھ بنی آدم کی ارواح اوپر چڑھتی ہیں تو وہ اس سب سے حسین تھی جو کچھ میں نے دیکھا تھا، کیا تم نے مرنے والے کی طرف نہیں دیکھا وہ کیسی تیز نظر سے اس کی طرف دیکھتا ہے پھر ہمیں اوپر لے جایا گیا یہاں تک کہ ہم آسمان دنیا کے دروازے پر پہنچ گئے۔ تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اسے کھولنے کو کہا تو پوچھا گیا: یہ کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: جبریل۔ انہوں نے پوچھا: آپ کے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ انہوں نے پوچھا: کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ پس انہوں نے میرے لئے دروازہ کھولا اور مجھے سلام کیا وہاں آسمان کا محافظ فرشتہ تھا اس کو اسماعیل کہا جاتا ہے اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے تھے اور ہر فرشتے کے ساتھ ایک لاکھ تھے۔۔۔۔۔۔ فرمایا وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (المدثر: 31) (اور کوئی نہیں جانتا آپ کے رب کے لشکروں کو بغیر اس کے) اور آگے حدیث ذکر کی یہاں تک کہ فرمایا: ''پھر ہم پانچویں آسمان پر پہنچے تو وہاں میری ملاقات حضرت ہارون بن عمران علیہ السلام سے ہوئی وہ اپنی قوم میں بڑے محبوب تھے اور ان کے اردگرد ان کی امت کے کثیر متبعین تھے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا وصف بیان کیا اور فرمایا: ان کی ریش مبارک طویل تھی حتیٰ کہ وہ ان کی ناف تک پہنچنے کے قریب تھی، پھر ہم چھٹے آسمان کی طرف چلے تو وہاں میرے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے انہوں نے مجھے سلام پیش کیا اور مرحبا کہا۔۔۔۔۔۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کا وصف بیان کیا اور فرمایا۔۔۔۔۔۔ وہ بہت زیادہ بالوں والے آدمی تھے اگر ان پر دو قمیصیں بھی ہوتیں تو ان سے ان کے بال باہر نکلے رہتے۔۔۔۔۔۔'' الحدیث۔

اور بزار نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گھوڑا لایا گیا اور آپ کو اس پر سوار کیا گیا۔ اس کا ہر قدم اپنی حد نگاہ پر پڑتا تھا۔۔۔۔۔۔ اور آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں براق کی صفت میں یہ موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس اثنا میں کہ میں حجر میں سویا ہوا تھا کہ اچانک میرے پاس ایک آنے والا آیا اور اس نے میرے پاؤں کو حرکت دی تو میں نے پلٹ کر ایک شخص کو دیکھا اور وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے جو مسجد کے

دروازے پر کھڑے تھے ان کے ساتھ ایک جانور تھا جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا اس کا چہرہ انسان کے چہرہ کی مثل تھا اس کے پاؤں کھر والے جانور کے پاؤں کی مثل تھے، اس کی دم بیل کی دم کی مثل تھی اور اس کی کلغی گھوڑے کی کلغی (مراد گردن کے بال تھے) کی مثل تھی پس جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اسے میرے قریب کیا تو وہ بدکنے لگا اور اس کی کلغی کے بال بکھر گئے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اسے ہاتھ پھیرا اور کہا: اے برقہ تو محمد ﷺ سے مت بدک قسم بخدا! کوئی مقرب فرشتہ تجھ پر سوار نہیں ہوا اور نہ کوئی نبی مرسل جو حضرت محمد ﷺ سے افضل ہو اور کوئی بھی ان سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معزز و مکرم نہیں۔ وقال یا برقہ لا تنفری من محمد ﷺ فواللہ ما رکبک ملک مقرب ولا نبی مرسل افضل من محمد ﷺ ولا اکرم علی اللہ منہ۔ اس نے جواب دیا میں جانتا ہوں کہ آپ اسی طرح ہیں اور یہ کہ آپ صاحب شفاعت ہیں اور میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں بھی اس کی شفاعت میں ہو جاؤں تو میں نے کہا: تو میری شفاعت میں ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ...... '' الحدیث۔

ابوسعید عبدالملک بن محمد نیشاپوری نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب حضور نبی مکرم ﷺ چوتھے آسمان میں حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا: مرحباً بالاخ الصالح والنبی الصالح (خوش آمدید صالح بھائی اور صالح نبی) جس کے بارے ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ہم اسے دیکھیں گے پس ہم نے اسے آج کی رات کے سوا نہیں دیکھا فرمایا: پس اس میں مریم بنت عمران تھیں ان کے لئے موتیوں کے بنے ہوئے ستر محل تھے اور حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی والدہ کے لئے ستر محل تھے جو سرخ مرجانہ کے بنے ہوئے تھے ان کے دروازے موتیوں سے مرصع تھے اور ان کے پلنگ ایک ہڈی سے بنے ہوئے تھے۔ پس جب معراج (سیڑھی) پانچویں آسمان کی طرف بلند ہوئی اور اس کے باسیوں کی تسبیح سبحان من جمع بین الثلج والنار (پاک ہے وہ ذات جس نے برف اور آگ کو اکٹھا کیا) جس نے یہ تسبیح ایک بار کہی اس کے لئے ان کے ثواب کی مثل ثواب ہوگا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دروازہ کھلوایا پس ان کے لئے دروازہ کھول دیا گیا پس وہاں ایک بوڑھا تھا اس سے زیادہ خوبصورت بوڑھا کبھی نہیں دیکھا گیا ان کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں ان کی ریش مبارک ناف کے قریب پہنچی ہوئی تھی اور قریب تھا کہ وہ سیاہ و سفید رنگ میں ہو۔ اور ان کے ارد گرد قوم بیٹھی ہوئی تھی وہ ان پر قصے بیان کر رہے تھے تو میں نے پوچھا: اے جبرائیل! یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا: یہ حضرت ہارون علیہ السلام ہیں جو اپنی قوم میں محبوب ہیں...... '' آگے پوری حدیث ذکر کی۔

یہ ان احادیث معراج کا مختصر خلاصہ ہے جو صحیحین سے خارج ہیں، انہیں ابوالربیع سلیمان ابن سبع نے مکمل طور پر کتاب ''شفاء الصدور'' میں ذکر کیا ہے۔ اہل علم اور جماعت اہل السیر کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نماز حضور نبی مکرم ﷺ پر مکہ مکرمہ میں اس وقت فرض کی گئی جس وقت آپ کو آسمان کی طرف سفر معراج پر لے جایا گیا۔ اور انہوں نے واقعہ معراج کی تاریخ اور نماز کی ہیئت میں اختلاف کیا ہے، کیا یہ معراج روح کو ہوئی یا آپ کے جسم کے ساتھ ہوئی؟ پس یہ تین مسائل ہیں جو اس آیت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، اور یہ ان میں سے ہیں جن پر واقفیت ہونی چاہئے اور ان کے بارے بحث ہونی چاہئے،

اور یہ ان احادیث کو بیان کرنے سے زیادہ اہم ہے، اور اب میں وہ ذکر کرتا ہوں جس پر علماء کے اقوال سے اور فقہاء کے اختلاف سے اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ میں واقف ہوا ہوں۔

جہاں تک پہلا مسئلہ ہے...... وہ یہ ہے کہ کیا معراج روح کے ساتھ ہوئی یا جسم کے ساتھ؟ اس کے بارے میں سلف و خلف کا اختلاف ہے، پس ایک گروہ کا موقف یہ ہے کہ معراج روح کو ہوئی، اور یہ کہ آپ کا جسم اقدس آپ کے بستر سے الگ نہیں ہوا، اور یہ کہ یہ خواب تھا جس میں آپ نے حقائق کو دیکھا، اور انبیاء علیہم السلام کے خواب حق ہیں۔ یہ نظریہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ہے، اور اسے حضرت حسن اور حضرت ابن اسحاق سے بیان کیا گیا ہے۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ معراج جسم کے ساتھ حالت بیداری میں بیت القدس تک ہوئی، اور آسمان تک روح کے ساتھ ہوئی، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا پس انہوں نے مسجد اقصیٰ کو اسراء کی غایت قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: اگر اسراء آپ کو جسم کے ساتھ مسجد اقصیٰ سے آگے تک ہوتی تو یقیناً اس کا ذکر ہوتا کیونکہ یہ مدح و تعریف میں مزید مبالغہ اور اضافہ ہے۔ اور عظیم اسلاف اور مسلمانوں نے یہ نظریہ اپنایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسم کے ساتھ حالت بیداری میں ہوئی، اور یہ کہ آپ مکہ مکرمہ سے براق پر سوار ہوئے، اور آپ بیت المقدس تک پہنچے، اس میں نماز پڑھی پھر وہاں سے جسم کے ساتھ معراج پر لے جایا گیا۔ اور اس پر وہ اخبار دلالت کرتی ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور آیت بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔ اور معراج کے جسم کے ساتھ اور حالت بیداری میں ہونے میں کوئی استحالہ نہیں ہے، اور ظاہر اور حقیقت سے تاویل کی طرف عدول تب کیا جاتا ہے جب کوئی استحالہ لازم آئے، اور اگر یہ خواب ہوتی تو اللہ تعالیٰ کہتا: بروح عبدہ (اپنے بندے کی روح کو) اور یہ نہ کہتا بعبدہ۔ اور قول باری تعالیٰ: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی ۝ (النجم) اس پر دلالت کرتا ہے۔ اور اگر یہ خواب ہوتی تو اس میں کوئی نشانی اور معجزہ نہ ہوتا، اور نہ ام ہانی آپ کو یہ کہتیں: آپ لوگوں کے سامنے بیان نہ کریں وہ آپ کو جھٹلا دیں گے۔ اور نہ اس کے سبب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فضیلت دی جاتی، اور نہ قریش کے لئے تشنیع و تکذیب ممکن ہوتی، حالانکہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے خبر دی تو قریش نے آپ کو جھٹلایا حتیٰ کہ کچھ لوگ مرتد ہو گئے جو ایمان لا چکے تھے۔ پس اگر یہ خواب ہوتی تو کوئی اس کا انکار نہ کرتا، حالانکہ مشرکین نے آپ کو کہا: اگر آپ سچے ہیں تو پھر ہمیں قافلے کے بارے بتائیے کہ کہاں آپ اس سے ملے تھے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فلاں فلاں جگہ میں اس کے پاس سے گزرا اور فلاں آدمی پریشان اور گھبرایا ہوا تھا"۔ تو اس کو کہا گیا: اے فلاں! تو نے کیا دیکھا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں نے کوئی شے نہیں دیکھی! سوائے اس کے کہ اونٹ بدکنے لگا ہے۔ پھر انہوں نے کہا: پس آپ ہمیں بتائیے: ہمارا قافلہ کب آئے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ تمہارے پاس فلاں فلاں دن پہنچے گا۔" انہوں نے پوچھا: کون سے وقت؟ آپ نے فرمایا: "میں نہیں جانتا، ادھر سے سورج پہلے طلوع ہوگا یا ادھر سے قافلہ پہلے آئے گا۔" پس اس دن ایک آدمی نے کہا: یہ سورج طلوع ہو گیا ہے۔ تو ادھر دوسرے آدمی نے کہا: یہ تمہارا قافلہ بھی آ گیا ہے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیت المقدس کی صفات و کیفیات

کے بارے معلومات طلب کیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ سب بیان فرمادیں حالانکہ اس سے پہلے آپ نے اسے نہیں دیکھا ہوا تھا۔ صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تحقیق میں حجر میں تھا اور قریش مجھ سے سفر معراج کے بارے پوچھنے لگے، تو انہوں نے مجھ سے بیت المقدس کے بارے میں کچھ چیزیں پوچھیں میں نے انہیں اچھی طرح محفوظ نہیں کیا ہوا تھا تو مجھے اتنی شدید پریشانی لاحق ہوئی کہ اس کی مثل پریشانی کبھی نہیں ہوئی تھی...... فرمایا: ''پس اللہ تعالیٰ نے اسے میرے لئے اٹھایا میں اس کی طرف دیکھنے لگا تو انہوں نے اس کے بارے مجھ سے جو شے بھی پوچھی میں نے اس کے بارے انہیں بتادیا(1)''۔ الحدیث۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے قول پر اعتراض یہ ہے: ''بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو معراج پر لے جایا گیا۔'' اس وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا چھوٹی عمر میں تھیں آپ نے اس کا مشاہدہ نہیں کیا، اور نہ آپ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بیان کیا ہے۔ اور رہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ! تو وہ اس وقت کافر تھے انہوں نے بھی نہ اس حال کا مشاہدہ کیا، اور نہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث بیان کی۔ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے جو اس سے زیادہ معلوم کرنا چاہے تو اسے چاہئے کہ وہ قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ کی ''کتاب الشفاء'' کا مطالعہ کرے اس سے وہ شفاء پالے گا۔ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نظریہ کے لئے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (الاسراء:60) (اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لئے) پس اسی وجہ سے انہوں نے اسے (معراج کو) رؤیا کا نام دیا ہے۔

اور اس کی تردید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا اور حالت خواب (کے سفر) کو اَسْرٰى نہیں کہا جاتا۔ اور یہ بھی کہ رؤیۃ العین (آنکھ کے ساتھ دیکھنے) کو بھی رؤیا کہا جاتا ہے، جیسا کہ اس کا بیان اسی سورت میں آئے گا۔ اور اخبار ثابتہ کی نصوص میں اس پر واضح دلالت ہے کہ معراج بدن کے ساتھ ہوئی، اور جب ایک شے کے بارے میں خبر بھی وارد ہو، عقل بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہونے کو جائز قرار دیتی ہو تو پھر اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، بالخصوص خلاف عادات امور کے زمانہ میں، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی معراجیں ہوئیں؛ اور یہ بعید نہیں کہ ان میں سے بعض حالت خواب میں ہوئی ہوں، اور اسی پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کو محمول کیا جائے گا جو صحیح میں ہے: بینا انا عند البیت بین النائم والیقظان(2) (اس اثنا میں کہ میں بیت اللہ شریف کے پاس حالت نیند اور بیداری کے درمیان تھا۔) الحدیث۔ اور یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ آپ اسراء سے نیند کی طرف لوٹے ہوں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ یہ معراج کی تاریخ کے بارے ہے، علماء نے اس میں بھی اختلاف کیا ہے، اور اس میں اختلاف ابن شہاب پر ہے، پس آپ سے موسیٰ بن عقبہ نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے سے ایک سال قبل بیت المقدس کی طرف سفر اسراء پر لے جایا گیا۔ اور آپ سے یونس نے عن عروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے یہ روایت کیا ہے کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے بیان کیا: حضرت ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا وصال نماز فرض کئے جانے سے پہلے ہوا۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرؤیا، باب فی المعراج، صفحہ 529 2۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ، جلد 1، صفحہ 455

ابن شہاب نے کہا ہے: یہ واقعہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے سات سال بعد پیش آیا۔ اور ان سے وقاصی نے یہ روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پانچ سال بعد آپ کو معراج پر لے جایا گیا۔ ابن شہاب نے کہا ہے: روزے مدینہ طیبہ میں بدر سے پہلے فرض کے گئے، اور زکوٰۃ اور حج مدینہ طیبہ میں فرض کیے گئے، اور شراب غزوہ احد کے بعد حرام کی گئی۔ اور ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ اور وہی بیت المقدس ہے کی طرف رات کے وقت لے جایا گیا، اور اسلام مکہ مکرمہ کے قبائل میں پھیلا۔ اور ان سے یونس بن بکیر نے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نماز ادا کی۔ عنقریب اس کا ذکر آرہا ہے۔ ابوعمر نے کہا: یہ قول تیری اس پر راہنمائی کرتا ہے کہ معراج ہجرت سے کئی سال پہلے ہوئی، کیونکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا وصال ہجرت سے پانچ سال پہلے ہوا۔ بعض نے کہا: تین سال پہلے ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار سال پہلے ہوا ہے۔ اور ابن اسحاق کا قول ابن شہاب کے قول کے مخالف ہے، اس بنا پر ابن شہاب سے اختلاف ہوا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حربی نے کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت سے ایک برس پہلے ماہ ربیع الثانی کی ستائیسویں رات کو معراج ہوئی۔ اور ابوبکر محمد بن علی بن قاسم ذہبی نے اپنی تاریخ میں کہا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کی طرف سفر اسراء پر لے جایا گیا اور وہاں سے آسمان کی طرف بلند کیا گیا اور یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اٹھارہ مہینے بعد پیش آیا۔ ابوعمر نے کہا ہے: اہل سیر میں سے میں کسی کو نہیں جانتا جس نے وہ کہا ہو جو ذہبی نے بیان کیا ہے، اور نہ انہوں نے اپنے قول کو کسی ایسے شخص کی طرف منسوب کیا ہے جن کی طرف اس علم کی نسبت کی جاتی ہے، اور نہ اسے ان میں سے کسی پر پیش کیا ہے جن سے حجت پکڑی جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ رہی نماز کی فرضیت اور اس کی ہیئت، جس وقت نماز فرض کی گئی، تو اہل علم اور اہل سیر کی جماعت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نماز مکہ مکرمہ میں شب معراج اس وقت فرض کی گئی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان کی طرف بلندی پر لے جایا گیا، صحیح وغیرہ میں اس پر نصوص موجود ہیں۔ البتہ انہوں نے نماز کی ہیئت میں اختلاف کیا ہے جس وقت یہ فرض ہوئی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نماز دو دو رکعتیں فرض کی گئی ہے، پھر مقیم کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا اور چار رکعتیں مکمل کر دی گئیں، اور حالت سفر کی نماز کو دو رکعتوں پر برقرار رکھا گیا، اسی طرح حضرت شعبی، میمون بن مہران اور محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: سوائے مغرب کے۔ یونس رحمۃ اللہ علیہ بن بکیر نے کہا ہے: اور ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت آئے جب آپ پر نماز فرض ہوئی یعنی اسراء میں پس انہوں نے وادی کے کنارے پر اپنی ایڑی ماری تو اس سے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اس سے وضو کیا اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے رہے۔ پس انہوں نے اپنا چہرہ دھویا، ناک میں پانی ڈالا اور کلی کی، اپنے سر اور اپنے کانوں کا مسح کیا اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا اور اپنی شرمگاہ پر پانی چھڑکا، پھر اٹھے اور دو رکعتیں چار سجدوں کے ساتھ نماز پڑھی، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی آنکھ کو ٹھنڈا کر دیا، آپ کا دل انتہائی خوش اور مطمئن تھا اور آپ اللہ تعالیٰ کے امر میں سے پسندیدہ امر لے کر آئے، پس آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا

ہاتھ پکڑا اور اسی چشمے پر لے آئے اور اسی طرح وضو کیا جیسے حضرت جبرائیل امین نے وضو کیا تھا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے دو رکعتیں چار سجدوں کے ساتھ پڑھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا برابر نماز پڑھتے رہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضر میں چار رکعتیں اور سفر میں دو رکعتیں نماز فرض ہوئی، اسی طرح نافع بن جبیر، حسن بن ابی الحسن بصری نے کہا ہے اور یہی ابن جریج کا قول ہے، اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو مروی ہے وہ اس سے موافقت کرتا ہے (1)۔

اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام شب معراج کی صبح کو زوال کے وقت نازل ہوئے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز اور اس کے اوقات سکھائے۔ یونس بن بکیر نے سالم مولی ابی المہاجر سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا میں نے میمون بن مہران کو کہتے سنا ہے کہ پہلے نماز دو رکعتیں تھی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعتیں نماز پڑھی تو وہی سنت ہوگئی، اور مسافر کے لئے اسی نماز کو برقرار رکھا گیا اور وہی مکمل نماز ہے۔ ابو عمر نے بیان کیا ہے: یہ ایسی اسناد ہے جس کی مثل سے استدلال نہیں کیا جا سکتا، اور ان کا قول: فصارت سنة (پس وہی سنت ہوگئی) یہ قول منکر ہے، اور اسی طرح شعبی رحمۃ اللہ علیہ کی اکیلے مغرب کی نماز کی استثنا کرنا بھی ہے اور انہوں نے صبح کا ذکر نہیں کیا تو یہ ایسا قول ہے جس کا کوئی معنی نہیں۔ تحقیق مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ حضر میں نماز کے فرض چار ہیں سوائے مغرب اور صبح کی نماز کے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے نہ عملاً اور نہ کسی خبر مستفیض سے نقلاً۔ اور جو اختلاف بھی اصل فرض میں ہے وہ ان کے لئے قطعاً ضرر رساں اور نقصان دہ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ اذان کے بارے میں بحث سورۃ المائدہ میں گزر چکی ہے، والحمد للہ۔ اور سورۂ آل عمران میں یہ گزر چکا ہے کہ پہلی مسجد جو زمین میں بنائی گئی وہ مسجد حرام ہے، پھر مسجد اقصیٰ ہے۔ اور یہ کہ ان دونوں کے درمیان چالیس برس کا فرق ہے، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا مسجد اقصیٰ اور آپ کا اس کے لئے بلانا حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے مروی ہے اور ان میں تطبیق کی وجہ بھی مذکور ہے، پس وہیں غور کر لو اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور یہاں ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ذکر کریں گے: لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثلاثة مساجد إلى المسجد الحرام وإلى مسجدي هذا وإلى مسجد ايلياء ...... او بيت المقدس (2) (کجاوے نہ کسے جائیں مگر تین مساجد کی طرف (یعنی) مسجد حرام کی طرف اور میری اس مسجد (مسجد نبوی) کی طرف، اور مسجد اقصیٰ کی طرف) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور اس میں جو ہے وہ تمام مساجد پر ان تین مساجد کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے، اسی لئے علماء نے کہا ہے: جس نے کسی مسجد میں نماز کی نذر مانی جس تک وہ سواری اور کجاوے کے بغیر نہ پہنچ سکتا ہو تو وہ اس پر عمل نہ کرے، اور وہ اپنی مسجد میں نماز پڑھ لے، سوائے مذکورہ تین مساجد کے، کیونکہ جس نے ان میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو وہ ان کی طرف نکلے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اہل علم کی ایک جماعت نے اس آدمی کے بارے میں کہا ہے جس نے سرحد پر لشکر کی حفاظت کے لئے چھاؤنی بنانے کی نذر مانی کہ وہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب ما جاء في الافطار للحامل، حدیث نمبر 1656، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد، حدیث نمبر 2525، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسے بند کر دے گا، تو وہیں اسے پورا کرنا اس پر لازم ہے جہاں چھاؤنی ہو کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری ہے۔ اور ابوالبختری نے اس حدیث میں مسجد الجند کا اضافہ کیا ہے، اور یہ صحیح نہیں ہے اور حدیث موضوع ہے، کتاب کے مقدمہ میں پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا مسجد اقصیٰ اور مسجد حرام کے درمیان بہت دوری اور بعد ہونے کی وجہ سے اس کا نام اقصیٰ رکھا گیا ہے، اور وہ زمین میں اہل مکہ سے بہت دور مسجد تھی زیارت کے ساتھ جس کی تعظیم وتکریم کی جاتی تھی، پھر فرمایا: الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ کہا گیا ہے: اس کے اردگرد پھلوں کے ساتھ اور نہریں جاری کرنے کے ساتھ ہم نے برکت رکھ دی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان انبیاء علیہم السلام اور صالحین کے سبب جو اس کے اردگرد مدفون ہیں ہم نے وہاں برکت رکھ دی ہے۔ اور اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے اسے مقدس بنا دیا ہے۔ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے شام تو میری جگہوں (زمین) میں سے عمدہ اور چنا ہوا علاقہ ہے اور میں اپنے بندوں میں سے انتہائی مخلص دوست تیری طرف بھیجنے والا ہوں (1)''۔ (شام کی اصل سام ہے اسے معرب بنایا گیا ہے) لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا یہ اسلوب کلام کی تبدیلی کے باب سے ہے۔ اور آیات اور نشانیاں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان عجائبات میں سے دکھائے جن کے بارے آپ نے لوگوں کو خبر دی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے مسجد اقصیٰ کی طرف ایک رات میں لے جانا حالانکہ ایک مہینے کی مسافت تھی، اور آپ کا آسمان کی طرف اوپر جانا اور آپ کا انبیاء علیہم السلام کا ایک ایک کر کے وصف بیان کرنا، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہے۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

وَ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا ۝

''اور دی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور بنایا ہم نے اس کتاب کو باعث ہدایت بنی اسرائیل کے لئے (اس میں انہیں حکم دیا) کہ نہ بناؤ میرے بغیر کسی کو (اپنا) کارساز''۔

یعنی ہم نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے ساتھ شرف وتکریم عطا فرمائی، اور ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب کے ساتھ عزت وتکریم عطا کی اور وہ تورات ہے۔ وَ جَعَلْنٰهُ اور ہم نے اس کتاب کو بنایا۔ یہ بھی کہا گیا ہے: ھا ضمیر سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں (2) (یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بنایا)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام کا معنی یہ ہے پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں اور موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی) پس اس طرح کلام غیب سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دینے (اخبار) کی طرف نکل گئی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: بے شک سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا کا معنی ہے اَسْرَیْنَا (ہم نے سیر کرائی) اور اس پر اس کا مابعد قول لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا دلالت کرتا ہے۔ اور وَ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ اسی معنی پر محمول ہے۔ اَلَّا تَتَّخِذُوْا ابو عمرو نے یتخذوا یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے، پس یہ اسلوب کلام کی تبدیلی کے باب سے ہے۔ وَكِیْلًا یعنی میرے بغیر کسی اور کو شریک نہ بنانا، پھر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 227-226
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 227

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تم میرے سوا کسی کو اپنے امور کا کفیل نہ بنانا؛ اسے فراء نے بیان کیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: تم میرے سوا کسی کو رب نہ بنانا جس پر وہ اپنے امور کے بارے توکل اور بھروسہ کرتے ہوں؛ یہ کلبی نے کہا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ بمعنی کافیاً ہے، اور تقدیر کلام ہے: عھدنا الیہ فی الکتاب الاَّ تَتَّخِذُوا من دونی وکیلاً (ہم نے انہیں کتاب میں نصیحت کی کہ تم میرے سوا کسی کو کارساز نہ بنانا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لئلا تتخذوا (تاکہ تم نہ بناؤ) اور الوکیل: وہ ہے جس کی طرف معاملہ (امر) سپرد کیا جاتا ہے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ③

''اے ان لوگوں کی اولاد! جنہیں ہم نے (کشتی میں) سوار کرایا نوح علیہ السلام کے ساتھ، بے شک نوح علیہ السلام ایک شکر گزار بندہ تھا''۔

یعنی یا ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا، اے ان لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے (کشتی میں) سوار کرایا! یہ ندا کی بنا پر ہے؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور ان سے اسے ابن ابی نجیح نے روایت کیا ہے اور ذریۃ سے مراد ہر وہ ہے جس پر قرآن سے حجت پیش کی گئی، اور وہ زمین پر بسنے والے تمام لوگ ہیں؛ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور ماوردی نے کہا ہے(1): مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل میں سے آپ کی قوم ہے، اور اس کا معنی ہے اے ان لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کیا! تم شرک نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا تاکہ وہ انہیں ان کے آباء کو غرق ہونے سے نجات دلانے کی نعمت یاد دلائے۔ اور سفیان نے حمید سے اور انہوں نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ذَرِّيَّةَ ذال کے فتحہ اور را اور یا کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس قرأت کو عامر بن واجد نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے بھی ذِرِّيَّة ذال کا کسرہ اور را اور یا کی شد مروی ہے۔ پھر بیان فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام شکر گزار بندے تھے وہ اللہ تعالیٰ کا اس کی ہر نعمت پر شکر ادا کرتے تھے اور ہر خیر اور بھلائی اس کی طرف سے جانتے تھے۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: جب وہ کپڑا پہنتے تھے تو کہتے: بسم اللہ، اور جب اتارتے تو کہتے: الحمد للہ۔ اسی طرح ان سے معمر نے روایت کیا ہے اور معمر نے منصور سے اور انہوں نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جب کھانے لگتے تو کہتے: بسم اللہ۔ اور جب کھانے سے فارغ ہوتے تو کہتے: الحمد للہ (2)۔ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: چونکہ وہ اپنے طعام پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے تھے (اس لئے وہ عبد شکور تھے۔) اور عمران بن سلیم نے بیان کیا ہے: بے شک حضرت نوح علیہ السلام کو عبداً شکوراً کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جب آپ کھانا تناول فرماتے تھے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے کھانا کھلایا اور اگر وہ چاہتا تو مجھے بھوکا رکھتا، (الحمد للہ الذی أطعمنی ولو شاء لأجاعنی)، اور جب (پانی وغیرہ) پیتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھے سیراب کیا اور اگر وہ چاہتا تو مجھے پیاسا رکھتا۔ (الحمد للہ الذی سقانی ولو شاء لأظمأنی) اور جب آپ

1۔ تفسیر ماوردی، سورۃ الاسراء، جلد 3، صفحہ 228
2۔ ایضاً

لباس پہنتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے لباس پہنایا اور اگر وہ چاہتا تو مجھے ننگا رکھتا۔ (الحمد لله الذی کسانی ولو شاء لأعرانی) اور جب جوتا پہنتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھے جوتا پہنایا ہے اور اگر وہ چاہتا تو مجھے ننگے پاؤں رکھتا۔ (الحمد لله الذی حذانی ولو شاء لأحفانی)، اور جب قضاء حاجت کرتے تو کہتے: سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے مجھ سے اذیت (اور تکلیف دہ شے) کو باہر نکال دیا اور اگر وہ چاہتا تو اسے میرے اندر روک لیتا۔ (الحمد لله الذی أخرج عنی الأذی ولو شاء لحبسه فی)(1) اور آیت کا مقصود یہ ہے: بے شک تم حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہو اور وہ شکر گزار بندے تھے پس ان کی اقتدا کرنا تمہارا زیادہ حق ہے نہ کہ اپنے جاہل آباء واجداد کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام شکر گزار بندے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے بنایا(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ ذُرِّيَّةَ، تَتَّخِذُوْا کا دوسرا مفعول ہو۔

اور قول باری تعالیٰ: وَكِيْلًا سے مراد جمع ہو پس یہ تمام دونوں قرأتوں میں جائز ہے، دونوں قرأتوں سے مراد تَتَّخِذُوْا میں یا اور تا کی قرأت ہے۔ اور دونوں قرأتوں میں ایک ساتھ یہ بھی جائز ہے کہ ذُرِّيَّةَ قول باری تعالیٰ: وَكِيْلًا سے بدل ہو کیونکہ یہ جمع کے معنی میں ہے؛ تو گویا اس نے یہ فرمایا: لا تتخذوا ذریة من حملنا مع نوح۔ (تم ان کی اولاد کو نہ بناؤ جنہیں ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا۔ اور اس کی نصب اعنی اور امدح فعل مضمر کے ساتھ بھی جائز ہے، اور عرب مدح وذم پر نصب دیتے ہیں۔ اور تَتَّخِذُوْا میں مضمر ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر رفع دینا بھی جائز ہے اس کی قرأت میں جس نے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور ان کے نزدیک اچھا نہیں جنہوں نے تا کے ساتھ قرأت کی ہے، کیونکہ مخاطب سے غائب بدل نہیں بن سکتا۔ اور دونوں صورتوں میں بنی اسرائیل سے بدل قرار دے کر اسے جر دینا بھی جائز ہے۔ پس رہا ان۔ قول باری تعالیٰ: اَلَّا تَتَّخِذُوْا میں تو یہ ان کی قرأت میں حرف جار کے حذف کے ساتھ محل نصب میں ہے جنہوں نے اسے یا کے ساتھ پڑھا ہے، تقدیر کلام ہے: هدیناهم لئلا یتخذوا (ہم نے ان کی راہنمائی فرمائی تاکہ وہ نہ بنائیں)۔ اور تا کی قرأت پر یہ زائدہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں قول مضمر ہو جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ان مفسرہ بمعنی أی ہو، اور اس کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو، اور لا نہی ہو پس یہ خبر سے نہی کی جانب خروج ہوگا۔

وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝

"اور ہم نے آگاہ کر دیا تھا بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم ضرور فساد برپا کرو گے زمین میں دو مرتبہ اور تم (احکام الٰہی سے) بڑی سرکشی کرو گے"۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ حضرت سعید بن جبیر اور ابوالعالیہ نے لفظ جمع کے ساتھ (3) فِي الْكُتُبِ پڑھا ہے۔ اور کبھی لفظ واحد ہوتا ہے اور اس کا معنی جمع ہوتا ہے، پس دونوں قرأتیں ایک ہی معنی میں ہوں گی۔ اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 25 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 228 3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 437

قَضَيْنَآ کا معنی (1) أعلمنا اور أخبرنا (ہم نے آگاہ کیا، اور ہم نے خبر دی) ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: معنی حکمنا ہے یعنی ہم نے فیصلہ کیا۔ اور قضا کا اصل معنی کسی شے کا فیصلہ کرنا اور اس سے فارغ ہونا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: قضینا بمعنی أوحینا (ہم نے وحی کی) ہے؛ اسی لئے فرمایا: اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اور حضرت قتادہ کے قول کے مطابق اِلیٰ بمعنی علی ہے؛ یعنی قضینا علیھم و حکمنا (ہم نے ان پر وحی کی اور ہم نے فیصلہ کیا) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی یہ کہا ہے۔ اور الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ لَتُفْسِدُنَّ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لَتُفْسَدُنَّ اور عیسیٰ ثقفی نے لَتَفْسُدُنَّ پڑھا ہے۔ اور دونوں قراءتوں میں معنی قریب قریب ہے، کیونکہ جب انہوں نے فساد برپا کیا تو وہ فاسد ہو گئے، اور یہاں فساد سے مراد تورات کے احکام کی مخالفت کرنا ہے۔ فِي الْاَرْضِ اس سے مراد شام، بیت المقدس اور اس کے آس پاس کی زمین ہے۔ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ۔ لَتُفْسِدُنَّ اور لَتَعْلُنَّ میں لام لام قسم مضمر ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ عُلُوًّا كَبِيْرًا اس سے مراد تکبر، بغاوت، سرکشی، رعونت، غلبہ اور عداوت و دشمنی ہے۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝

"پس جب آ گیا پہلا وعدہ ان دونوں وعدوں سے تو ہم نے (تمہاری سرکوبی کے لئے) بھیج دیئے اپنے چند بندے جو بڑے کرخت (اور) سخت تھے پس وہ گھس گئے (تمہاری) آبادیوں میں، اور جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا تھا وہ پورا ہو کر رہنا تھا"

قولہ تعالیٰ: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا یعنی جب ان کے فساد کی دو باریوں میں سے پہلی بار آ گئی۔ بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ وہ اہل بابل تھے، اور ان پر پہلی بار میں بخت نصر حاکم تھا جس وقت انہوں نے حضرت ارمیاء کو جھٹلایا، انہیں زخمی کر دیا اور انہیں قید کر لیا؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: ان پر جالوت کو بھیجا اور اس نے انہیں قتل کر دیا، پس وہ اور اس کی قوم بڑے کرخت اور سخت تھے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فارس سے ایک لشکر ان کے پاس آیا وہ ان کی خبروں کی جاسوسی کرنے لگے اور ان کے ساتھ بخت نصر بھی تھا پس اس نے اپنے ساتھیوں کے درمیان سے ان کی باتیں یاد کر لیں، پھر وہ فارس کی طرف لوٹ گئے اور جنگ نہ ہوئی، اور یہ پہلی بار میں ہوا، پس ان کی طرف سے آبادیوں میں گھسنا اور گھومنا پھرنا ہوا قتال اور جنگ نہ ہوئی)، اسے قشیری ابو نصر نے ذکر کیا ہے۔ اور مہدوی نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے کہ ان کے پاس بخت نصر آیا اور بنی اسرائیل نے اسے شکست دی، پھر وہ دوسری بار ان کے پاس آیا اس نے انہیں قتل کیا اور انہیں مکمل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ اور ابن ابی نجیح نے اسے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور محمد بن اسحاق نے ایک طویل خبر میں کہا ہے: بے شک شکست کھانے والا سخاریب بادشاہ بابل تھا، وہ آیا اور اس کے ساتھ چھ لاکھ جھنڈے تھے اور ہر جھنڈے کے نیچے ایک لاکھ شہسوار تھے پس وہ بیت المقدس کے گرد آ کر اترا تو اللہ تعالیٰ نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 437

اسے شکست سے دوچار کیا اور سخاریب اور اس کے کاتبوں میں سے پانچ آدمیوں کے سوا سبھی کو مار دیا، اور بنی اسرائیل کے بادشاہ جس کا نام صدیقہ تھا اسے سخاریب کی تلاش میں بھیجا پس وہ اپنے پانچوں ساتھیوں سمیت پکڑا گیا، ان میں سے ایک بخت نصر تھا، پس ان کی گردنوں میں طوق ڈالے گئے اور انہیں ستر دن تک بیت المقدس اور ایلیاء کے ارد گرد گھمایا اور چکر لگوایا جاتا رہا۔ اور وہ ان میں سے ہر آدمی کو ہر روز جو کی دو روٹیاں دیتا تھا، پھر اس نے انہیں چھوڑ دیا اور وہ بابل کی طرف واپس لوٹ گئے، پھر سات برس بعد سخاریب فوت ہو گیا، اور اس نے بخت نصر کو اپنا خلیفہ اور نائب بنایا اور بنی اسرائیل میں نئے واقعات اور بدعات بڑھ چکی تھیں۔ انہوں نے محارم کو حلال قرار دیا تھا اور اپنے نبی حضرت شعیا علیہ السلام کو قتل کر دیا تھا، پس بخت نصر وہاں آیا اور وہ اپنے لشکر سمیت بیت المقدس میں داخل ہو گیا اور بنی اسرائیل کا قتل عام کیا یہاں تک کہ انہیں فناہ اور بالکل تباہ کر دیا۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ پہلا فساد حضرت زکریا علیہ السلام کا قتل ہے۔ اور ابن اسحاق نے کہا: پہلی بار میں ان کا فساد اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت شعیا علیہ السلام کو درخت میں قتل کرنا ہے۔ وہ اس طرح کہ صدیقہ فوت ہو گیا تو ان کے بادشاہ نے ان کا معاملہ (کام) خراب کر دیا اور وہ بادشاہ پر غالب آ گئے اور آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے اور اپنے نبی علیہ السلام کی بات بھی نہ سنتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا: اٹھو اپنی قوم میں جاؤ اور اپنی زبان میں انہیں پیغام پہنچاؤ۔ پس جب وہ اس کے بیان سے فارغ ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی تھی تو وہ لوگ آپ پر دوڑ کر آ گئے تا کہ وہ آپ کو قتل کر دیں پس آپ بھاگ پڑے اور آپ کے لئے ایک درخت پھٹ گیا (اس میں شگاف ہو گیا) اور آپ اس میں داخل ہو گئے، اور شیطان نے آپ کو پالیا پس اس نے آپ کے کپڑے کا پلو پکڑ لیا اور انہیں وہ دکھا دیا، تو انہوں نے اس درخت کے درمیان میں آری رکھ دی اور اسے چیر ڈالا یہاں تک کہ انہوں نے درخت کو اور اس کے وسط میں آپ کو بھی کاٹ ڈالا۔ اور ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے انہیں یہ خبر دی ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا وصال اپنی طبعی موت سے ہوا، انہیں قتل نہیں کیا گیا اور جنہیں قتل کیا گیا وہ حضرت شعیا علیہ السلام تھے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے قول باری تعالیٰ: بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَٰلَ الدِّيَارِ میں کہا ہے: وہ موصل کے اہل نینوی میں سے سخاریب بادشاہ بابل تھا (1)۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جو ابن اسحاق نے کہا ہے۔ فاللہ اعلم۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ عمالقہ تھے اور وہ کافر تھے، یہ حسن نے کہا ہے۔ اور جَاسُوا کا معنی ہے: انہوں نے فساد برپا کیا اور قتال کیا اور اسی طرح حاسوا، ھاسوا اور داسوا بھی ہیں؛ یہ ابن عزیز نے کہا ہے، اور یہی قتبی کا قول ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے حاسوا حا مہملہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو زید نے کہا ہے: الحوس، الجوس، العوس اور الھوس ان تمام کا معنی رات کے وقت گھومنا، چکر لگانا ہے۔ اور جوہری نے کہا ہے: الجوس تیرے قول جاسوا خلال الدیار کا مصدر ہے، یعنی وہ آبادی میں گھس گئے اور اسے تلاش کیا جو کچھ اس میں تھا جیسا کہ ایک آدمی خبریں تلاش کرتا ہے اور اسی طرح لفظ اجتیاس بھی ہے۔ اور الجَوَسان (واؤ متحرک کے ساتھ) رات کا طوفان یا تباہ کن موت ہوتی ہے اور یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 229

اور علامہ طبری نے کہا ہے: وہ گھروں کے درمیان گھومتے رہے اور انہیں تلاش کرنے لگے اور شدت اور سختی کے ساتھ قتل کرنے لگے، پس انہوں نے اہل لغت کے قول کے درمیان تطبیق کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: وہ چلے اور آبادی اور گھروں کے درمیان گھومنے لگے۔ اور فراء نے کہا ہے: انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں میں قتل کیا ہے۔

اور حضرت حسان کا یہ شعر بھی نقل کیا:

و منا الذی لاق بسیف محمد فجاس به الأعداء عرض العساکر(1)

اور قطرب نے کہا ہے: وہ اترے۔

شاعر نے کہا ہے:

فجُسْنَا دیَارَھم عُنْوَۃً و أُبْنَا بساداتھم مُوثَقِینَا(2)

وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا یعنی یہ وعدہ اس طرح پورا ہونے والا ہے جس کا خلاف ہرگز نہ ہوگا۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَیْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِیْرًا ۝

''پھر ہم نے پلٹا دیا تمہارے حق میں زمانہ کی گردش کو جو دشمن کے خلاف تھی اور ہم نے قوت دی تمہیں مال سے، بیٹوں سے اور بنا دیا تمہیں کثیر التعداد''۔

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَیْهِمْ یعنی ہم نے تمہارے حق میں زمانے کی گردش اور رجعت کو پلٹا دیا، اور یہ اس وقت ہوا جب تم نے توبہ کی اور اطاعت اختیار کر لی۔ پھر کہا گیا ہے: یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے جالوت کو قتل کرنے یا کسی اور کو قتل کرنے کے سبب ہوا(3)، یہ اس کے بارے میں اختلاف ہونے کی بنا پر ہے جس نے انہیں قتل کیا۔ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ (اور ہم نے مال اور بیٹوں سے تمہیں قوت دی) یہاں تک کہ تم اسی حالت پر لوٹ آئے جس پر پہلے تھے۔ وَ جَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِیْرًا اور ہم نے تمہیں تعداد اور مردوں کے اعتبار سے تمہارے دشمن سے زیادہ کر دیا۔ اور نفیر وہ ہے جو اپنے خاندان میں سے کسی مرد کے ساتھ چلے، کہا جاتا ہے نفیر ونافر جیسا کہ قدیر اور قادر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ النفیر، نفر کی جمع ہو جیسا کہ کلیب، کلب کی اور معیز، معز کی، اور عبید، عبد کی جمع ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فَاُكْرِمْ بقحطان من والد و حِمْیَرَ أكرم بقوم نفیرا(4)

اور اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اس پہلے واقعہ کے بعد اتفاق کرنے اور احوال کی اصلاح کرنے کے اعتبار سے زیادہ ہو گئے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے اطاعت و فرمانبرداری پر لوٹنے کی جزا اور بدلہ ہے۔

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۟ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 229
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 230
3۔ ایضاً
4۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 440

لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَ لِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ لِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝

''اگر تم اچھے کام کرو گے تو ان کا فائدہ تمہیں ہی پہنچے گا۔ اور اگر تم برائی کرو گے تو اس کی سزا بھی (تمہارے) نفسوں کو ملے گی، پس جب آ گیا دوسرا وعدہ (تو اور ظالم ان پر غالب آ گئے) تا کہ غمناک بنا دیں تمہارے چہروں کو اور تا کہ (جبرا) داخل ہو جائیں مسجد میں جیسے داخل ہوئے تھے اس میں پہلی مرتبہ تا کہ فنا و برباد کر کے رکھ دیں جس پر قابو پائیں۔''

قولہ تعالیٰ: اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ یعنی اگر تم اچھے کام کرو گے تو تمہاری نیکی اور اچھے کام کا نفع تم پر ہی لوٹ کر آئے گا۔ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ای فعليها۔ اور اگر تم برائی کرو گے تو اس کی سزا بھی تمہیں پر ہو گی، جیسا کہ سلام لك بمعنی سلام علیك ہے (یعنی تجھ پر سلام ہو)۔ کسی شاعر کا قول ہے:

فخر صريعا لليدين وللفم

اس میں بھی لام بمعنی علی ہے (یعنی وہ ہاتھوں اور منہ کے بل پر گرا)۔ اور طبری نے کہا ہے: لام بمعنی الی ہے، یعنی وان اسأتم فاليها، یعنی اگر تم برائی کرو گے تو اسی (نفس) کی طرف برائی کی سزا لوٹے گی۔) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ (الزلزال) اس میں بھی لَهَا بمعنی الیھا ہے (بے شک تیرے رب نے اس کی طرف وحی کی۔) اور کہا گیا ہے: فلها الجزاء و العقاب۔ پس اسی کے لئے جزا اور سزا ہو گی۔ اور حسین بن فضل نے کہا ہے: فلها رب يغفر الاساءة۔ (پس اس کے لئے رب ہے جو برائی کو معاف فرما سکتا ہے)۔ پھر یہ احتمال ہے کہ یہ خطاب پہلی بار میں بنی اسرائیل کو ہو، یعنی تم نے برے عمل کئے تو تمہیں قتل کرنا، قید کرنا، اور تباہ و برباد کرنا حلال ہو گیا بعد ازاں تم نے اچھے عمل کئے تو بادشاہی، بلندی اور انتظام حال تمہاری طرف لوٹ آئے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہو، یعنی تم نے گناہوں کی وجہ سے سزا کے لئے اپنے اسلاف کا استحقاق پہچان لیا ہے پس تم بھی اسی کی مثل کا انتظار کرو یا یہ اسی وجہ کی بنا پر مشرکین قریش کو خطاب ہو۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ پس جب تمہارے فساد پھیلانے کے بارے دوسرا وعدہ آ گیا؛ اور وہ یہ کہ انہوں نے دوسری مرتبہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو قتل کر دیا، انہیں بنی اسرائیل کے بادشاہ نے قتل کیا تھا اس کو لاخت کہا جاتا تھا؛ یہ قتبی نے کہا ہے۔ اور علامہ طبری نے کہا ہے: اس کا نام ہیرودس تھا، اسے انہوں نے تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ اور ایک آزبیل نامی عورت نے اسے آپ کے قتل پر ابھارا تھا۔ اور علامہ سدی نے کہا ہے: بنی اسرائیل کا بادشاہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کی بڑی عزت و تکریم کرتا تھا اور وہ معاملات میں آپ سے مشاورت کرتا تھا، پس بادشاہ نے آپ سے یہ مشورہ طلب کیا کہ وہ اپنی بیوی کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے تو آپ نے اسے اس سے منع کر دیا اور فرمایا: بلاشبہ وہ تیرے لئے حلال نہیں ہے، پس اس کی ماں کے دل میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے حقد اور عداوت پیدا ہو گئی، پھر اس نے اپنی بیٹی کو باریک

سرخ کپڑے پہنائے اور اسے خوب معطر کیا اور اسے بادشاہ کی طرف بھیج دیا اس حال میں کہ وہ شراب میں مست تھا۔ اور اس نے اسے حکم دیا کہ وہ اسے چھیڑ چھاڑ کرے، اور اگر وہ اس کی طرف متوجہ ہو تو وہ انکار کر دے یہاں تک کہ وہ اسے وہ کچھ عطا کرے جو وہ اس سے مانگتی ہے، اور جب وہ اسے قبول کر لے تو پھر وہ اس سے مطالبہ کرے کہ یحییٰ بن زکریا کا سر سونے کی ٹرے میں رکھ کر لایا جائے، پس اس نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ وہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کا سر لے آیا اور سر گفتگو کرتا رہا یہاں تک کہ جب وہ اس کے سامنے رکھا گیا تو وہ کہہ رہا تھا: لاتحل لك، لاتحل لك (یہ تیرے لئے حلال نہیں ہے، یہ تیرے لئے حلال نہیں ہے) پس جب صبح ہوئی تو ان کا خون ابھی کھول رہا تھا، پس اس نے اس پر مٹی ڈالی تو وہ پھر اس سے زیادہ کھولنے لگا، پس وہ مسلسل اس پر مٹی ڈالتا رہا یہاں تک کہ وہ شہر کی فصیل تک پہنچ گیا اور وہ اس میں بھی کھولتا رہا؛ اسے ثعلبی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

اور حافظ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت حسین بن علی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ ان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ مر گیا اور اس نے اپنی بیوی اور ایک بیٹی پیچھے چھوڑی اور اس کی سلطنت کا وارث اس کے بھائی کو بنایا گیا، تو اس نے اپنے بھائی کی بیوی سے شادی کرنے کا ارادہ کیا، تو اس نے اس بارے میں حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام سے مشاورت کی، اس زمانے میں بادشاہ انبیاء علیہم السلام کے حکم کے مطابق عمل کرتے تھے، تو آپ نے اسے کہا: تو اس سے شادی نہ کر کیونکہ وہ فاحشہ عورت ہے، پس اس عورت کو بتا دیا گیا کہ اس نے اس کا ذکر کیا ہے اور آپ نے اسے اس سے پھیر دیا ہے، تو اس عورت نے پوچھا: یہ کہاں سے ہوا ہے؟ یہاں تک کہ اس تک یہ خبر پہنچ گئی کہ یہ یحییٰ کی جانب سے ہوا ہے، تو اس نے کہا کہ یحییٰ کو ضرور قتل کیا جائے گا یا اسے اس ملک سے نکال دیا جائے گا، پس اس نے اپنی بیٹی کو بلایا اور اس کا خوب بناؤ سنگار کر کے اسے تیار کیا، پھر اسے کہا: تو اپنے چچا کے پاس مجلس کے وقت جا کیونکہ وہ جب تجھے دیکھے گا تو وہ تجھے بلائے گا اور تجھے اپنے حجرہ میں بٹھالے گا، اور وہ کہے گا: مجھ سے مانگ جو تو چاہتی ہے، کیونکہ جو شے بھی تو مجھ سے مانگے گی وہ میں تجھے عطا کروں گا، پس جب وہ تجھے یہ کہے، تو تو یہ کہنا: مجھے یحییٰ کے سر کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔ راوی نے کہا: ان بادشاہوں میں سے جب کوئی سر مجلس کسی شے کے بارے بات کر دیتا پھر اسے پورا نہ کرتا تو اس سے بادشاہی چھین لی جاتی، پس اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے کہا: یحییٰ کو قتل کرنے سے بھی اسے موت آئے گی اور اپنی سلطنت سے باہر نکلنے سے بھی اسے موت آئے گی، چنانچہ اس نے اپنے ملک کو اختیار کیا اور آپ کو قتل کر دیا۔ راوی نے بیان کیا: پس اس لڑکی کی ماں کو زمین نے اپنے اندر نگل لیا (یعنی وہ زمین میں دھنس گئی)۔

ابن جدعان نے کہا ہے: میں نے یہ حدیث حضرت ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیان کی تو انہوں نے فرمایا: کیا میں تجھے خبر نہ دوں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کیسے قتل کئے گئے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں، تو انہوں نے بیان کیا: حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے کو جس وقت قتل کیا گیا تو وہ ان سے بھاگ نکلے اور ان لوگوں نے ان کا تعاقب کیا یہاں تک کہ آپ ایک موٹے تنے والے درخت کے پاس پہنچ گئے تو اس نے آپ کو اپنی طرف بلایا اور آپ کو اپنے اندر چھپا لیا اور آپ کے کپڑے کا ایک کنارہ (جھالر) باہر رہ گئی ہوائیں اسے اڑانے لگیں، پس وہ بھی چلتے ہوئے اس درخت کے پاس آپہنچے اور انہوں نے اس

درخت کے بعد آپ کا کوئی اثر اور نشان نہ پایا، اور انہوں نے اس کپڑے کے ٹکڑے کی طرف دیکھا اور پھر آری منگائی اور اس درخت کو کاٹ دیا اور اس کے ساتھ آپ کو بھی کاٹ دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علامہ طبری نے "التاریخ الکبیر" میں بیان کیا ہے کہ ابوالسائب نے مجھے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں ابومعاویہ نے اعمش سے انہوں نے منہال سے انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے یحییٰ بن زکریا کو ان بارہ حواریوں میں بھیجا جو لوگوں کو تعلیم دیتے تھے، فرمایا: وہ چیزیں جن سے انہوں نے لوگوں کو منع کیا ان میں بھائی کی بیٹی سے نکاح بھی تھا۔ فرمایا: اور ان کے بادشاہ کے بھائی کی بیٹی تھی جو اسے پسند تھی آگے خبر مذکورہ خبر کے مثل ہی بیان کی۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو ان بارہ حواریوں میں بھیجا گیا جو لوگوں کو تعلیم دیتے تھے، اور جو وہ لوگوں کو تعلیم دیتے تھے اس میں وہ انہیں بھانجی کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کرتے تھے، اور ان کے بادشاہ کی بھانجی تھی وہ اسے چاہتی تھی، اور وہ ارادہ رکھتا تھا کہ اس سے شادی کر لے، ہر روز اس کی کوئی حاجت ہوتی تھی تو وہ اسے پورا کر دیتا تھا، پس جب یہ خبر اس کی ماں کو پہنچی کہ انہوں نے بھانجی کے ساتھ نکاح کرنے سے منع کیا ہے تو اس نے اسے کہا: جب تو بادشاہ کے پاس جائے اور وہ پوچھے: کیا تیری کوئی حاجت ہے؟ تو تو یہ کہنا: میری حاجت یہ ہے کہ تو یحییٰ بن زکریا کو ذبح کر دے، پس بادشاہ نے اس سے کہا: تو اس کے سوا مجھ سے مانگ! تو اس نے کہا: میں تجھ سے اس کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ پس جب اس نے اس کا انکار کیا تو اس نے ایک ٹب منگایا اور آپ کو بھی بلایا اور آپ کو ذبح کر دیا، پس آپ کے خون کا قطرہ زمین کے چہرے پر ظاہر اور نمایاں ہو گیا پس وہ مسلسل ابلتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا اور ان کے دل میں یہ بات القا کر دی کہ وہ انہیں اسی خون پر قتل کرے یہاں تک کہ یہ خون ساکن ہو جائے، پس اس نے اس پر ان میں سے ستر ہزار افراد قتل کئے، اور ایک روایت میں "پچھتر ہزار کا ذکر ہے۔ حضرت سعید ابن مسیب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: یہ ہر نبی علیہ السلام کی دیت ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی کی ہے کہ میں نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے بدلے ستر ہزار افراد کو قتل کیا، اور میں تمہارے نواسے کے بدلے ستر ہزار کو قتل کروں گا۔ اور سمیر بن عطیہ سے روایت ہے انہوں نے کہا ہے: وہ چٹان جو بیت المقدس میں ہے اس پر ستر انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا گیا ان میں سے حضرت یحییٰ بن زکریا بھی ہیں۔ اور زید بن واقد سے روایت ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے سر کو اس وقت دیکھا جب انہوں نے مسجد دمشق بنانے کا ارادہ کیا، وہ اس گنبد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے نیچے سے نکلا جو اس محراب کے ساتھ ملتا ہے جو مشرق کی جانب ملتا ہے، اور آپ کا چہرہ اور بال مبارک اپنی اصلی حالت پر تھے کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ اور قرہ بن خالد نے کہا ہے: حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام اور حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے سوا آسمان کسی پر نہیں رویا اور اس کی سرخی اس کا رونا ہی ہے۔ اور حضرت سفیان بن عیینہ نے کہا ہے: تین مقامات میں ابن آدم زیادہ وحشت زدہ ہوتا ہے: ایک پیدا ہونے کے دن پس وہ غم و

اندوہ کے دار کی طرف نکل کر آتا ہے، اور ایک اس رات جو وہ مردوں کے ساتھ گزارتا ہے پس وہ ایسے پڑوسیوں کا پڑوسی بن جاتا ہے جن کی مثل اس نے پہلے نہیں دیکھے، اور ایک اس دن جب اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور وہ اس جگہ حاضر ہو گا جس کی مثل اس نے پہلے نہیں دیکھی؛ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لئے ان تینوں مقامات کے بارے فرمایا: وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝ (مریم) (اور سلامتی ہو ان پر جس روز وہ پیدا ہوئے اور جس روز وہ انتقال کریں گے اور جس روز انہیں اٹھایا جائے گا زندہ کر کے) یہ سب مذکورہ تاریخ سے لیا گیا ہے۔ اور اس کے بارے میں اختلاف ہے جسے ان پر دوسری بار بھیجا گیا، پس کہا گیا ہے کہ وہ بخت نصر تھا۔ اور یہ قشیری ابو نصر نے کہا ہے، ان کے سوا کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ سہیلی نے کہا ہے: یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد قتل کیا گیا، اور بخت نصر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام سے بہت عرصہ پہلے اور اسکندر سے بھی پہلے ہوا ہے اور اسکندر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان تقریباً تین سو سال کا عرصہ ہے، لیکن دوسری بار سے مراد وہ لی گئی ہے جس وقت انہوں نے حضرت شعیا کو قتل کیا تھا، اس وقت بخت نصر زندہ تھا، پس یہی وہ ہے جس نے انہیں قتل کیا اور بیت المقدس کو خراب اور برباد کیا اور مصر تک ان کا پیچھا کیا اور انہیں وہاں سے نکال دیا۔ اور ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جس نے یہ روایت کیا ہے کہ بخت نصر وہ ہے جس نے بنی اسرائیل پر اس وقت حملہ کیا جس وقت انہوں نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو قتل کیا تھا وہ اہل السیر والاخبار کے نزدیک غلط ہے، کیونکہ ان تمام کا اس پر اجماع ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل پر اس وقت حملہ کیا تھا جس وقت انہوں نے حضرت شعیا علیہ السلام کو قتل کیا تھا اور یہ ارمیاء کے عہد میں ہوا تھا۔ انہوں نے بیان کیا: ارمیاء کے عہد اور بخت نصر کے بیت المقدس کو خراب و برباد کرنے سے لے کر حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کی ولادت تک درمیان میں چار سو اکسٹھ برس کی مدت ہے، اور یہ کہ وہ بیت المقدس کی تخریب سے لے کر کوسک کے عہد میں اس کی آبادی تک ستر برس کا عرصہ ہے، پھر اس کی آبادی کے بعد سے لے کر بیت المقدس پر اسکندر کے غلبہ تک اٹھاسی برس ہیں، پھر اسکندر کی مملکت کے بعد سے لے کر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت تک تین سو تریسٹھ سال ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ سب علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس میں سے صحیح وہ ہے جو محمد بن اسحاق نے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لیا اور انہوں نے یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا...... اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کیا...... تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف بابل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ بھیجا اس کو خردوس کہا جاتا تھا۔ پس وہ اہل بابل کے ساتھ ان کی طرف چلا اور ان پر شام کے ساتھ غلبہ پا لیا، پھر اس نے اپنے سالار لشکر کو کہا: میں نے اپنے الہ کی قسم کھائی ہوئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے بیت المقدس پر غلبہ دیا تو میں ضرور انہیں قتل کروں گا یہاں تک کہ ان کا خون میرے لشکر کے درمیان سے بہے گا، اور اس نے اسے حکم دیا کہ وہ انہیں قتل کریں یہاں تک کہ وہ ان تک پہنچ جائے، پس وہ سالار لشکر بیت المقدس میں داخل ہوا تو اس نے اس میں ابلتا ہوا خون دیکھا تو اس نے ان سے اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے بتایا: یہ قربانی کا خون

ہے ہم نے اسے قربان کیا لیکن اسی برس سے یہ ہماری طرف سے قبول نہیں ہوئی۔ اس نے کہا: تم نے میرے سامنے سچ نہیں کہا، پس اس نے ان سرداروں میں سے سات سو ستر افراد کو اس خون پر ذبح کیا لیکن وہ پرسکون نہ ہوا، [پھر ان کے بچوں میں سے سات سو بچے لائے گئے اور وہ اس خون پر ذبح کئے گئے لیکن وہ پرسکون نہ ہوا] پھر اس نے ان کے قیدیوں اور ان کی عورتوں میں سے سات ہزار لانے کا حکم دیا اور اس نے انہیں اس خون پر ذبح کیا لیکن وہ ٹھنڈا نہ ہوا، تب اس نے کہا: اے بنی اسرائیل! مجھے سچ سچ بتاؤ اس سے پہلے کہ میں تم میں سے کوئی عورت آگ کو پھونک مارنے کے لئے بھی نہ چھوڑوں اور نہ کوئی مرد چھوڑوں مگر اسے قتل کر دوں۔ پس جب انہوں نے مشقت اور تکلیف کو دیکھا تو کہنے لگے: بیشک یہ ہمارے نبی علیہ السلام کا خون ہے وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بننے والے بہت سے امور سے منع کرتے تھے تو ہم نے انہیں قتل کر دیا، پس یہ انہی کا خون ہے۔ ان کا اسم گرامی حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام تھا، انہوں نے کبھی آنکھ جھپکنے کی دیر بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی اور نہ معصیت کا قصد کیا، تو اس نے کہا: اب تم نے مجھے سچ بیان کیا ہے، اور وہ سجدہ میں گر گیا پھر اس نے کہا: اب اس کی مثل کا تم سے انتقام لیا جائے گا، اور اس نے دروازے بند کرنے کا حکم دیا اور کہا: خردوس کے لشکر میں سے جو یہاں ہیں تم باہر نکل جاؤ، اور وہ بنی اسرائیل کے لئے خالی ہو گئی اس نے کہا: اے نبی اللہ! اے یحییٰ بن زکریا علیہما السلام تحقیق میرا اور آپ کا رب جانتا ہے آپ کی وجہ سے آپ کی قوم پر جو آفت اور مصیبت آئی، پس اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرسکون ہو جاؤ اس سے پہلے کہ میں ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑوں۔ پس حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کا خون اللہ عزوجل کے حکم سے ٹھنڈا ہو گیا، اور اس نے ان سے قتل کو اٹھا لیا اور کہا: اے میرے رب! بلاشبہ میں اس کے ساتھ ایمان لایا جس کے ساتھ بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، پس اللہ تعالیٰ نے رؤس الانبیاء میں سے ایک رأس کی طرف وحی بھیجی۔ بے شک یہ سالار مومن ہے اور بہت سچا ہے۔ پھر اس نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ کے دشمن خردوس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم میں سے اتنے لوگوں کو قتل کروں کہ تمہارا خون اس کے لشکر کے درمیان سے بہہ کر جائے۔ اور بلاشبہ میں اس کی نافرمانی اور حکم عدولی نہیں کر سکتا، پس اس نے انہیں حکم دیا کہ وہ خندق کھودیں اور انہیں اپنے مالوں میں سے اونٹ، گھوڑے، خچر گدھے، گائیں اور بکریاں وغیرہ لانے کا حکم دیا پس انہوں نے انہیں ذبح کیا یہاں تک کہ خون لشکر کی طرف بہہ گیا، اور وہ مقتول جو اس سے پہلے قتل کئے گئے تھے انہیں ان ذبح کئے گئے جانوروں پر پھینک دیا گیا، پھر وہ ان سے بابل کی طرف لوٹ گیا، حالانکہ یہ قریب تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو تباہ و برباد کر دیتا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس باب میں طویل حدیث مرفوع موجود ہے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ہم نے اسے (کتاب التذکرہ) میں ابواب فی اخبار المہدی میں مقطوع ذکر کیا ہے، ہم اس میں سے یہاں اتنا ذکر کریں گے جو آیت کے معنی کی وضاحت کر دے گا اور اس کی تفسیر بیان کر دے گا یہاں تک کہ اس کے ساتھ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہوگی، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی عظیم، عالیشان اور قدر و مرتبہ کے اعتبار سے عظیم الشان ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ ان اعلیٰ و ارفع اور بلند مرتبہ گھروں

میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے لئے سونے، چاندی، موتی، یاقوت اور زمرد سے بنایا۔'' اور وہ اس طرح کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے جب اسے بنایا تو اللہ تعالیٰ نے جن ان کے لئے مسخر کر دیئے (ان کے تابع بنا دیئے) پس وہ معادن (کانیں) سے سونا اور چاندی لے آتے تھے، اور وہ آپ کے پاس جواہر، یاقوت اور زمرد لے آتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے جن آپ کے تابع رکھے یہاں تک کہ انہوں نے ان اصناف سے اسے بنا دیا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: سو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ چیزیں بیت المقدس سے کیسے اٹھالی گئیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا اور وہ مجوسی (آتش پرست) تھا اور اس کی حکومت سات سو سال تک رہی، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا پس وہ بیت المقدس میں داخل ہوئے اور مردوں کو قتل کر دیا اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا اور اموال اور وہ سب کچھ جو ان اصناف میں سے بیت المقدس میں تھا سب جمع کر لیا اور اسے ایک لاکھ ستر ہزار سامان لادنے والی گاڑیوں پر لاد دیا یہاں تک کہ اسے بابل پہنچا دیا، پس وہ وہیں مقیم رہے۔ بنی اسرائیل سے خدمت لیتے رہے اور سو برس تک ذلت و رسوائی اور سزا و عذاب کے ساتھ ان پر حکومت کرتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کو یہ القا کیا کہ وہ بابل کی زمین میں مجوسیوں کی طرف چلے، اور ان کے قبضے میں بنی اسرائیل میں سے جو ہیں انہیں نجات دلائے، پس وہ بادشاہ ان کی طرف چل پڑا یہاں تک کہ وہ بابل کے علاقے میں داخل ہو گیا اور مجوسیوں کے ہاتھوں میں جو بنی اسرائیل کے لوگ باقی تھے انہیں چھڑایا اور وہ زیورات جو بیت المقدس سے وہ لے آئے تھے وہ بھی ان سے لے لئے اور اللہ تعالیٰ نے اسے اسی مقام پر واپس لوٹا دیا جس پر وہ پہلے تھے پس اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا: اے بنی اسرائیل اگر تم پھر گناہوں اور نافرمانی کی طرف لوٹ گئے تو ہم بھی قید اور قتل و غارت کو تم پر لوٹا دیں گے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا (الاسراء: 8) (قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے گا اور اگر تم فسق و فجور کی طرف دوبارہ لوٹے تو ہم بھی لوٹیں گے) اور جب بنی اسرائیل بیت المقدس کی طرف لوٹ کر آئے تو دوبارہ گناہوں اور نافرمانیوں کا ارتکاب کرنے لگے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر شاہ روم قیصر کو مسلط کر دیا، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝ پس اس نے ان پر بحر و بر میں حملہ کیا اور انہیں قیدی بنایا انہیں قتل کیا اور ان کے اموال اور ان کی عورتوں کو اٹھا لیا، اور بیت المقدس کے جمیع زیورات بھی اٹھا لئے اور انہیں ایک لاکھ ستر ہزار سامان والی گاڑیوں پر لاد دیا، یہاں تک کہ انہیں کنیسۃ الذھب میں پہنچا دیا۔ پس وہ اب بھی اس میں ہیں حتیٰ کہ حضرت مہدی علیہ السلام اسے اٹھائیں گے اور اسے بیت المقدس کی طرف لوٹا دیں گے، اور ایک ہزار سات سو کشتیوں کو یافا پر لنگر انداز کیا جائے گا یہاں تک کہ اسے بیت المقدس کی طرف منتقل کر دیا جائے گا اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع کر دے گا''۔ اور آگے حدیث ذکر کی۔

قولہ تعالیٰ: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ یعنی دونوں باریوں میں سے جب دوسرا وعدہ آ گیا۔ اور اِذَا کا جواب محذوف ہے، تقدیر کلام ہے: بعثناھم (تو ہم نے ان پر مسلط کر دیا) اور اس پر دلیل پہلا بَعَثْنَا ہے۔ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ تاکہ قید اور قتل کے ساتھ تمہارے چہروں کو غمناک بنا دیں۔ اور اس غم کا اثر تمہارے چہروں میں ظاہر ہونے لگے۔ پس لِیَسُوْٓءٗا محذوف کے متعلق ہے، یعنی ہم نے ایسے بندے بھیج دیئے (مسلط کر دیئے) تاکہ وہ تمہارے ساتھ ایسا برتاؤ اور سلوک کریں جو تمہارے چہروں کو سیاہ اور غمزدہ کر دے۔ یہ بھی کہا گیا ہے: الوجوہ سے مراد سرداری ہے یعنی تاکہ وہ انہیں ذلیل ورسوا کر دیں۔ اور کسائی نے لِنَسُوْءَ نون اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اپنے بارے میں خبر دینے والے کا فعل عظیم الشان ہے، اور یہ کہ اسے قول باری تعالیٰ: وَقَضَیْنَا اور بَعَثْنَا، رَدَدْنَا پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا ہے۔ اور اسی طرح علی سے مروی ہے۔ اور اس کی تصدیق حضرت ابی کی قرأت لنسوءن نون اور حرف تاکید کے ساتھ ہوتی ہے (1)۔ ابوبکر، اعمش، ابن وثاب، حمزہ اور ابن عامر نے لِیَسُوْءَ صیغہ واحد کی بنا پر یاء اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے لیسوٴ اللہ وجوھکم (تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو غمناک بنا دے۔) اور دوسری یہ ہے لیسوٴ الوعد وجوھکم (تاکہ وہ وعدہ تمہارے چہروں کو غمزدہ کر دے) اور باقیوں نے لِیَسُوْءٗا صیغہ جمع کی بنا پر یا اور ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تاکہ وہ لوگ جو کرخت اور قوت و طاقت والے ہیں تمہارے چہروں کو غمناک بنا دیں۔ وَلِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِیُتَبِّرُوْا اور تاکہ وہ (جبراً) مسجد میں داخل ہو جائیں جیسے وہ پہلی بار اس میں داخل ہوئے تھے تاکہ وہ تباہ و برباد اور ہلاک کر دیں۔ اور قطرب نے کہا ہے: تاکہ وہ اسے گرا دیں۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

فما الناس إلا عاملان فعاملٌ يُتَبِّرُ ما يَبْنِي و آخر رافع (2)

مَا عَلَوْا یعنی تمہارے شہروں میں سے جس پر وہ غالب آ جائیں۔ تَتْبِیْرًا (مکمل طور پر تباہ و برباد کرنا)

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ ۚ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ۝

"قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے گا اور اگر تم فسق و فجور کی طرف دوبارہ لوٹے تو ہم بھی لوٹیں گے، اور ہم نے بنا دیا جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ۔"

قولہ تعالیٰ: عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ اور یہ (خبر) ان میں سے ہے جس کے بارے انہیں ان کی کتاب میں خبر دی گئی ہے اور عَسٰی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے کہ وہ ان سے (اس تکلیف اور غم کو) دور فرما دے گا، اور عَسٰی کا لفظ اللہ تعالیٰ سے واجب (اور ثابت) ہونے کے معنی میں ہوتا ہے۔ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ کہ تمہارا رب تم سے اپنا انتقام لینے کے بعد تم پر رحم فرمائے گا، اور پھر اسی طرح ہوا، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کو بڑھا دیا اور ان سے کئی بادشاہ بنائے۔ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: پس وہ دوبارہ (فسق و فجور کی طرف) لوٹ آئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو غالب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 440 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 231

فرمادیا۔ اور وہ بڑی رزالت اور حقارت کے ساتھ جزیہ دینے لگے؛ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور یہ اس کے خلاف ہے جو پہلے حدیث وغیرہ میں گزر چکا ہے۔ اور قشیری نے کہا ہے: تحقیق بنی اسرائیل پر عذاب اور سختی دوبارہ کفار کے ہاتھوں سے آئی اور ایک بار مسلمانوں کے ہاتھوں سے۔ اور یہ اس وقت ہوا جب وہ دوبارہ فسق و فجور کی طرف لوٹ آئے تو اللہ تعالیٰ (کی گرفت) بھی ان پر لوٹ آئی۔ اور اس بنا پر حضرت قتادہ کا قول صحیح لگتا ہے۔ وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ اور جیل بنادیا ہے۔ یہ الحصر سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی حبس (قید کرنا) ہے۔ جوہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے حَصَرَهُ يَحْصِرُهُ حَصْرًا اس نے اس پر تنگ کردیا اور اس کا احاطہ کرلیا۔ اور الحصير: الضيق البخيل (سخت بخیل) اور الحصیر کا معنی البارية (تراشیدہ) ہے۔ اور الحصیر سے مراد پہلو بھی ہے۔ اصمعی نے کہا ہے: وہ ہڈی جو اونٹ اور گھوڑے کے پہلو میں ظاہر ہوتی ہے اس سے لے کر عرضا اوپر کی جانب پہلو کے ختم ہونے تک درمیان میں جو (گوشت) ہے وہ حصیر کہلاتا ہے۔ اور الحصیر سے مراد بادشاہ بھی ہے، کیونکہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔

لبید نے کہا ہے:

و قَمَاقِمٍ غُلْبِ الرقاب كأنهم　　جِنٌّ لدى باب الحَصِيرِ قيام(1)

اس میں الحصیر سے مراد بادشاہ لیا گیا ہے۔

اور روایت کیا جاتا ہے: و مَقَامَةٍ غُلْبِ الرقاب...... یہ اس بنا پر ہے کہ غلب، مقامۃ سے بدل ہو گویا کہ اس طرح کہا: و رُبَّ غُلْبِ الرقاب۔ اور ابوعبیدہ سے مروی ہے:

لدى طرف الحصير

قیام یعنی نعمان بن منذر کی چٹائی کے کنارے کے پاس۔ اور الحصیر کا معنی قید خانہ بھی ہے (2)، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا اور علامہ قشیری نے کہا ہے: جس کو بچھایا جاتا ہے وہ حصیر کہلاتی ہے، کیونکہ بنائی کے سبب اس کے بعض حصے بعض کو روکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے: أي فراشا و مهادا (یعنی اللہ تعالیٰ نے جہنم کو کافروں کے لئے فرش اور بچھونا بنادیا ہے) (یعنی) یہ اس طرف گئے ہیں کہ حصیر وہ ہے جسے بچھایا جاتا ہے، کیونکہ عرب چھوٹی چٹائی کو حصیر کا نام دیتے ہیں، ثعلبی نے کہا ہے: اور یہ خوبصورت توجیہ ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَ يُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّ اَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۰﴾

''بلاشبہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب راہوں سے سیدھی راہ ہے اور مژدہ سناتا ہے ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں کہ بلاشبہ ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ اور بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 440　　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 231

تیار کر دیا ہے ان کے لئے دردناک عذاب"۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ جب اللہ تعالیٰ نے معراج کا ذکر فرمایا اور اس کے ساتھ بنی اسرائیل کے بارے جو وعدہ اور فیصلہ کیا اس کا ذکر کیا، اور یہ حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل ہے، پھر یہ بیان فرمایا کہ وہ کتاب جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمائی وہ ہدایت پانے کا سبب اور ذریعہ ہے۔ اور لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ کا معنی ہے الطریقة التی هی أسدّ و أعدل و أصوب۔ یعنی یہی وہ راہ ہے جو زیادہ سیدھی، موزوں اور صحیح ہے، پس التی موصوف محذوف کی صفت ہے، یعنی الطریقة التی هی أقوم۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہی وہ حال ہے جو تمام حالات سے زیادہ صحیح اور موزوں ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے رسولوں کے ساتھ ایمان لانا ہے، اور یہ کلبی اور فراء نے کہا ہے(1)۔ قولہ تعالیٰ: وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اَنَّ لَهُمْ ای بأن لهم (اعمال صالحہ کے سبب) ان کے لئے اَجْرًا كَبِیْرًا (بڑا اجر ہے) یعنی جنت ہے۔ وَّاَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یعنی اور انہیں مژدہ سنا رہا ہے کہ ان کے دشمنوں کے لئے عذاب وعقاب ہے۔ اور قرآن کریم اس کی شان اور عظمت وعدہ و وعید ہے۔ اور حمزہ اور کسائی نے وَیَبْشُرُ مخفف یا کے فتحہ اور شین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے؛ اس کا ذکر بھی پہلے کر دیا گیا ہے۔

وَیَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝۱۱

"اور دعا مانگا کرتا ہے انسان برائی کے لئے جیسے دعا مانگا کرتا ہے بھلائی کے لئے، اور (حقیقت یہ ہے کہ) انسان بڑا جلد باز (واقع ہوا) ہے"۔

قولہ تعالیٰ: وَیَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: یہ آدمی کا اپنی ذات اور اپنی اولاد کے خلاف غصے اور تنگی کی حالت میں دعا کرنا ہے ایسی شے کے بارے جس کے قبول ہونے کو وہ پسند نہیں کرتا(2) کہ اے اللہ! اسے ہلاک کر دے وغیرہ دُعَآءَهٗ بِالْخَیْرِ جیسا کہ وہ اپنے رب سے یہ دعا کرتا ہے کہ وہ اس کو عافیت عطا فرمائے، پس اگر اللہ تعالیٰ شر اور برائی کے بارے اس کی دعا اس کے اپنے خلاف قبول کر لے تو وہ ہلاک ہو جائے لیکن وہ اپنے فضل کے ساتھ اس کے لئے اسے قبول نہیں کرتا۔ اس کی نظیر یہ ہے: وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَیْرِ (یونس: 11) (اور اگر جلد بازی کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر پہنچانے میں جیسے وہ جلد بازی کرتے ہیں بھلائی کے لئے) اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ دعا مانگ رہا تھا اور کہہ رہا تھا: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۳۲ (الانفال) (اے اللہ! اگر یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب۔) اور کہا گیا ہے کہ وہ ممنوع چیز کی طلب میں دعا مانگتا ہے جیسا کہ مباح چیز کی طلب میں دعا مانگتا ہے۔

جیسا کہ شاعر ابن جامع نے کہا ہے:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 232　　2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 441

أطوف بالبیت فیمن یطوف وأرفع من مئزری المسبلِ

میں بیت اللہ کا طواف کرنے والوں میں اس کا طواف کرتا ہوں اور اپنی لٹکی ہوئی چادر اٹھالیتا ہوں۔

وأسجدُ باللیل حتی الصباح وأتلو من المحکم المنزّلِ

اور میں رات کے وقت صبح تک عبادت کرتا ہوں اور نازل کی گئی محکم کتاب کی تلاوت کرتا ہوں۔

عسی فارجُ الھمّ عن یوسف یُسخّر لی ربة المَحْمِلِ

پس قریب ہی تو یوسف سے غم دور ہونے کا امیدوار رہ، وہ میرے لئے محمل کے مالک کو تابع کردے گا۔

علامہ جوہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے ماعلی فلان مِحمل جیسا کہ مَجْلِس ہے یہ بمعنی معتمد ہے یعنی (فلاں پر اعتماد نہیں) اور محمل، محامل الحاج کا واحد بھی ہے (حاجیوں کو اٹھانے والا ہودج) اور مِحمل جیسا کہ مِرجل ہے اس کا معنی ہے تلوار کی پیٹی۔ اور وَیَدْعُ الْاِنْسَانُ سے لفظ اور خط (یعنی پڑھنے اور لکھنے) میں واو حذف کردی گئی ہے لیکن معنی میں یہ حذف نہیں ہوئی کیونکہ یہ محل رفع میں ہے لیکن اس کے سامنے لام ساکن آنے کی وجہ سے اسے حذف کردیا گیا ہے، جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: سَنَدْعُ الزَّبَانِیَۃَ (العلق) وَیَمْحُ اللّٰہُ الْبَاطِلَ (الشوریٰ: 24) وَسَوْفَ یُؤْتِ اللّٰہُ الْمُؤْمِنِیْنَ (النساء: 146) یُنَادِ الْمُنَادِ (ق: 41) فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (القمر) (ان میں پہلی دو آیتوں میں واو اور آخری تین میں یاء لام ساکنہ کی وجہ سے حذف کردی گئی ہیں)۔ وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا یعنی انسان کے مزاج اور طبیعت میں جلد بازی اور تیزی ہے، پس یہ برائی کے سوال میں اسی طرح جلد بازی اور تیزی کرتا ہے جس طرح خیر اور بھلائی مانگنے میں جلدی کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے اشارہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف ہے کہ جس وقت وہ روح کے مکمل طور پر اپنے بدن میں داخل ہونے سے پہلے ہی اٹھ بیٹھے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا سر تخلیق فرمایا پس وہ دیکھتے رہے درآنحالیکہ ان کا جسم تخلیق ہوتا رہا، پس جب عصر کا وقت ہوا ان کی ٹانگیں ابھی باقی تھیں ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی تو انہوں نے کہا: اے میرے پروردگار! رات آنے سے پہلے پہلے جلدی کیجئے؛ تو اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: جب پھونک ان کی ناف تک پہنچ گئی تو انہوں نے اپنے جسم کی طرف دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ قادر نہ ہوسکے؛ پس اس کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَکَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: جب روح ان کی آنکھوں میں داخل ہوئی تو انہوں نے جنت کے پھلوں کی طرف دیکھا، اور جب ان کے پیٹ میں داخل ہوئی تو کھانے کی چاہت پیدا ہوئی تو روح کے اپنی ٹانگوں کی طرف پہنچنے سے پہلے ہی جنت کے پھلوں کی طرف جلدی سے اچھل پڑے، تو اسی وقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء: 37) (انسان کی سرشت میں جلد بازی ہے۔) اسے بیہقی نے ذکر کیا ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کی تصویر بنائی تو جتنا اللہ تعالیٰ نے چھوڑنا چاہا اسے چھوڑ دیا تو ابلیس اس کے اردگرد چکر لگاتا رہا اور

دیکھتا رہا کہ وہ کیا ہے؟ پس جب اس نے آپ کا پیٹ دیکھا تو وہ پہچان گیا کہ یہ ایسی مخلوق پیدا کی گئی ہے جو اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکے گی (1)''۔ یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قیدی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کیا تو وہ رات کے وقت کراہنے لگا، آپ نے اس سے وجہ دریافت کی تو اس نے کہا: میرے کراہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چمڑے کا تسمہ شدید اور سخت بندھا ہوا ہے، چنانچہ آپ نے اسے بندھے ہوئے تسمے کو تھوڑا ڈھیلا کر دیا پس جب آپ سو گئیں تو وہ بھاگ گیا، تو آپ نے اس کی اطلاع حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تیرے ہاتھ کاٹ دے (2)''۔ پس جب صبح ہوئی تو آپ اس آفت کی توقع کرنے لگیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ میں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی ہے کہ وہ میری دعا اس کے خلاف کر دے جو میری اہل میں سے رحمت کا مستحق نہیں ہے کیونکہ میں بھی انسان ہوں غصے میں ہو جاتا ہوں جیسا کہ انسان غصے میں ہو جاتا ہے''۔ اور یہ آیت نازل ہوئی؛ اسے ابو نصر قشیری نے ذکر کیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اے اللہ! بلاشبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بشر ہے غضبناک ہوتا ہے جیسے انسان غصے میں ہوتا ہے اور بلاشبہ میں نے تجھ سے ایک عہد لے رکھا ہے اور تو ہرگز میرے ساتھ اس کا خلاف نہیں کرے گا پس جس مومن کو بھی کوئی اذیت پہنچاؤں یا اسے گالی دوں یا اسے کوڑے کے ساتھ ماروں تو تو اسے اس کے لئے کفارہ اور ذریعہ قربت بنا دے۔ اسے اس کے سبب قیامت کے دن اپنا قرب عطا فرمانا (3)'' اور اس باب میں حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے بھی روایات ہیں۔ اور کہا گیا ہے: وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا کا معنی ہے کہ وہ جلدی ملنے والی شے (دنیا) کو ترجیح دیتا ہے اگرچہ وہ قلیل ہے، دیر سے ملنے والی پر (آخرت پر) اگرچہ وہ عظیم اور زیادہ ہے۔

وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا ۝

''اور ہم نے بنایا ہے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دو نشانیاں اور ہم نے مدہم کر دیا رات کی نشانی کو اور بنا دیا دن کی نشانی کو روشن تا کہ (دن کے اجالے میں) تم تلاش کرو رزق اپنے رب سے اور تا کہ تم جان لو سالوں کی تعداد اور حساب کو، اور ہر چیز کو ہم نے بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ جَعَلْنَا الَّیْلَ وَ النَّهَارَ اٰیَتَیْنِ یعنی ہم نے رات اور دن کو اپنی وحدانیت، وجود اور اپنے کمال علم وقدرت پر دو علامتیں اور نشانیاں بنایا۔ اور ان دونوں میں علامت اور نشانی یہ ہے: ان دونوں میں سے ہر ایک کا وہاں سے آنا جسے کوئی

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والادب، خلق الانسان خلقا لا یتمالك، جلد 2، صفحہ 327

2۔ مجمع الزوائد، کتاب علامات النبوة، ما جاء فی دعائه واشتراطه فیه، جلد 8، صفحہ 477، حدیث 13993

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والادب، من لعنه النبی أو سبه او دعا علیه ولیس هو اهلاً، جلد 2، صفحہ 324

نہیں جاننا اور اس کی طرف واپس لوٹتا ہے جسے کوئی نہیں جانتا۔ اور دونوں میں سے ایک کا دوسرے کے مقابلے میں کم اور زیادہ ہونا اور پھر اس کا برعکس ہو جانا، یہ بھی علامت اور نشانی ہے۔ اور اسی طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریک ہونا بھی ہے۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ اور یہ نہیں فرمایا: فمحونا اللیل (ہم نے رات کو مٹا دیا) پس جب آیت (نشانی) کی اضافت رات اور دن کی طرف کی تو اس پر دلیل ہے کہ مذکورہ دونوں آیتیں (نشانیاں) ان دونوں کے لیے ہیں نہ کہ یہ دونوں ہیں۔ اور مَحَوْنَا کا معنی ہے: ہم نے مٹا دیا۔

اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم فرمایا تو انہوں نے اپنا پر چاند کے چہرہ پر سے گزارا تو اس کی روشنی مٹ گئی حالانکہ وہ نور ... روشنی میں سورج کی مثل تھا، اور وہ سیاہی جو چاند میں دکھائی دیتی ہے وہ اسی مٹنے کا اثر ہے۔ حضرت ابن عباس ... نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سورج کے ستر جز بنائے اور چاند کے بھی ستر جز بنائے، پھر چاند کے نور سے انہتر جز مٹا دیئے اور انہیں سورج کے نور کے ساتھ رکھ دیا۔ پس سورج کے نور کے ایک سو انتالیس جز بن گئے، اور چاند کا ایک جز باقی رہا۔ اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش کے نور سے دو سورج پیدا کئے، اور پھر وہ کیا جو اس کے علم میں پہلے تھا کہ اس دنیا کے مشارق و مغارب کی مقدار کے برابر اس پر ایک سورج ہو، اور چاند کو سورج سے کم بنایا۔ پھر جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا اور انہوں نے اپنا پر تین بار چاند کے چہرہ پر پھیرا اور وہ اس وقت سورج تھا پس اس کی روشنی مدہم پڑ گئی اور اس کا نور باقی رہا، پس وہ سیاہی جو تم چاند میں دیکھتے ہو وہ اس مٹنے کا اثر ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اسے سورج ہی باقی رہنے دیتا تو پھر رات اور دن کے درمیان پہچان نہ ہو سکتی۔ پہلے قول کو ثعلبی نے اور دوسروں کو مہدوی نے ذکر کیا ہے اور عنقریب یہ مرفوع روایت بھی آئے گی۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے کہ محو سے مراد وہ سیاہ داغ ہے جو چاند میں دکھائی دیتا ہے، تا کہ چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے کم ہو جائے اور رات دن سے ممتاز ہو جائے۔ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً یعنی ہم نے دن کے سورج کو آنکھوں کو روشن کرنے والا بنایا۔ ابو عمرو بن علاء نے بیان کیا ہے: یعنی وہ اس کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: اور یہ عربوں کے قول میں سے ہے أبصر النهار جب دن خوب روشن ہو جائے، اور وہ اس حال میں ہو جائے کہ اس کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے اس قول کی طرح ہے خبیث مُخْبِث جب اس کے ساتھی خبثاء ہوں۔ اور رجل مضعف جب اس کی سواری کمزور ہو، پس اسی طرح النهار مبصرا جب اس کے اہل دیکھنے والے ہوں۔

لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ اس سے مراد معاش (اور کاروبار حیات) میں تصرف کرنا ہے۔ اور رات کے وقت آرام اور سکون کا ذکر نہیں کیا اسی پر اکتفا کرتے ہوئے جو دن کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (یونس: 67) (وہ ہے جس نے بنائی تمہارے لئے رات تاکہ تم آرام کرو اس میں اور روشن دن بنایا۔) وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ یعنی اگر وہ اس طرح نہ کرتا تو رات دن سے نہ پہچانی جا سکتی، اور نہ ہی حساب اور تعداد معلوم ہو سکتی۔ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا یعنی احکام تکلیفی میں سے ہر شے ہم نے تفصیل سے بیان کر

دی ہے، اور یہ اس ارشاد کی طرح ہے: تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل: 89) (اس میں تفصیلی بیان ہے ہر چیز کا) مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: 38) (نہیں نظر انداز کیا ہم نے کتاب میں کسی چیز کو)۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا اور اس کی مخلوق میں سے سوائے آدم کے کوئی باقی نہ رہا تو اس نے اپنے عرش کے نور سے سورج اور چاند پیدا فرمائے اور یہ دونوں دو سورج تھے پس وہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے تھا کہ وہ ان میں سے ایک کو سورج چھوڑے گا پس اس نے اسے اس دنیا کی مثل پیدا کیا جو اس کے مشارق و مغارب کے درمیان ہے اور رہا وہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ ایک کو چاند بنا دے گا تو اسے اس نے سورج سے کم تخلیق فرمایا لیکن آسمان کی انتہائی بلندی میں ہونے اور زمین میں بہت دور ہونے کی وجہ سے یہ دونوں چھوٹے دکھائی دیتے ہیں پس اگر اللہ تعالیٰ سورج اور چاند دونوں کو اسی طرح چھوڑ دیتا جیسے اس نے ان دونوں کو تخلیق فرمایا تو رات کو دن سے نہ پہچانا جا سکتا اور نہ ایک مزدور یہ جان سکتا کہ وہ کب تک کام کرے گا اور نہ روزے دار کو معلوم ہوتا کہ وہ کب تک روزہ رکھے گا اور نہ عورت جان سکتی کہ وہ عدت کیسے گزارے گی اور نہ نمازوں اور حج کے اوقات معلوم ہو سکتے اور نہ قرض اتارے جا سکتے اور نہ یہ معلوم ہو سکتا کہ کس وقت بیج ڈالنا ہے اور فصل کاشت کرنی ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا کہ وہ اپنے بدنوں کو راحت پہنچانے کے لئے کب آرام کر سکتے ہیں گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی طرف دیکھا اور وہ ان کے ساتھ ان کے اپنے آپ سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا اور انہوں نے چاند کے چہرے پر اپنا پر تین بار پھیرا اور وہ اس وقت سورج تھا پس اس سے روشنی مٹ گئی اور اس میں نور باقی رہ گیا پس اسی کے بارے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ الآیہ''۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝

''اور ہر انسان کی (قسمت کا) نوشتہ اس کے گلے میں ہم نے لٹکا رکھا ہے۔ اور ہم نکالیں گے اس کے لئے روز قیامت ایک کتاب جسے وہ (اپنے سامنے) کھلا ہوا پائے گا۔ (اسے حکم ملے گا) پڑھ اپنا دفتر عمل تم خود ہی کافی ہو آج اپنی باز پرس کرنے کے لئے''۔

قولہ تعالیٰ: وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ زجاج نے کہا ہے: عنق (گردن) کا ذکر لزوم (لازم ہونا) سے عبارت ہے جیسا کہ گردن کے لئے قلادہ (ہار) کا لازم ہونا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: طٰٓئِرَهٗ یعنی اس کا عمل اور جو اس پر خیر و شر میں سے مقدر ہے(1)، اور وہ اسے لازم ہوتا ہے جہاں وہ ہو۔ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کی نیکی اور اس کی برائی اس کے ساتھ ہوگی۔ اس کا عمل اور اس کا رزق (اس کے ساتھ لازم ہے)، اور انہی سے مروی ہے: کوئی بچہ نہیں جو پیدا ہوتا ہے مگر اس کی گردن میں ایک کاغذ ہوتا ہے جس میں اس کا شقی (بدبخت ہونا) یا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 442

سعید (1) (سعادتمند ہونا) لکھا ہوتا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ یعنی اس کی شقاوت اور سعادت اور جو کچھ خیرو شر میں سے اس کے لئے لکھا ہوا ہے اور جو اس کے لئے تقدیر میں سے لکھا ہوا ہے (2)۔ (ہم نے وہ اسے لازم کر دیا ہے) یعنی وہ ازل میں تقسیم کے وقت اس کے لئے ہو گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے ارادہ تکلیف (مکلف بنانا) کا ہے، یعنی ہم نے اسے شریعت کو لازم پکڑنے کا پابند بنا دیا ہے۔ اور وہ اس حیثیت سے ہے کہ اگر وہ وہ کام کرنا چاہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے اور اس سے باز رہے جس سے اسے روکا گیا ہے تو یہ اس کے لئے ممکن ہے۔ وَ نُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا یعنی اس کی وہ کتاب جو اس کے گلے میں لٹکی ہوگی (اسے وہ قیامت کے دن اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا) حسن، ابو رجا اور مجاہد رحمہم اللہ نے طَيْرَهٗ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور اسی کے مطابق وہ ہے جو خبر میں مروی ہے اَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ اِلَّا خَيْرُكَ وَلَا طَيْرَ اِلَّا طَيْرُكَ وَلَا رَبَّ غَيْرُكَ (اے اللہ! کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے سوائے تیری بھلائی کے اور کوئی نصیب نہیں ہے سوائے تیرے نصیب (عطا کرنے کے) اور تیرے سوا کوئی رب (پروردگار) نہیں ہے۔) حضرت ابن عباس، حسن، مجاہد، ابن محیصن، ابو جعفر، اور یعقوب نے وَيَخْرُجُ یا کے فتحہ اور را کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کا معنی ہوگا ويخرج له الطائر كتابا (اور اس کا نصیب ظاہر ہوگا اس حال میں کہ وہ لکھا ہوگا)۔ پس كتاباً حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو: ويخرج الطائر فيصير كتاباً (اور اس کا نصیب ظاہر ہوگا پس وہ لکھا ہوا ہو جائے گا)۔ اور یحییٰ بن وثاب نے وَيُخْرِجُ یا کے ضمہ اور را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نکالے گا۔ اور شیبہ اور محمد بن سمیقع نے اور اسی طرح ابو جعفر سے بھی روایت ہے: وَيُخْرَجُ فعل مجہول کی بنا پر یا کے ضمہ اور را کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور اس کا معنی ہے: اور اس کے لئے قسمت کا نوشتہ نکالا جائے گا۔ اور باقیوں نے وَيُخْرِجُ نون کے ضمہ اور را کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے: بمعنی و نحن نُخْرِجُ (اور ہم نکالیں گے) ابو عمرو نے اس قرأت میں قول باری تعالیٰ: اَلْزَمْنٰهُ سے استدلال کیا ہے۔ اور ابو جعفر، حسن اور ابن عامر نے يُلَقّٰىهُ یا کو ضمہ، لام کو فتحہ اور قاف کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، بمعنی يُؤْتَاهُ (وہ اسے دیا جائے گا) اور باقیوں نے یا کے فتحہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ای يراه منشورا (وہ اسے کھلا دیکھے گا) اور فرمایا: مَنْشُوْرًا یعنی نیکی کے سبب بشارت اور خوشخبری میں اور برائی کے سبب زجر و توبیخ میں جلدی کرنے والا۔ ابو السوار عدوی نے کہا ہے: اور یہ آیت پڑھی وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ اور فرمایا: یہ دونوں کھلے اور لپٹے ہوئے ہیں پس اے انسان! جب تک تو زندہ ہے تو تیرا صحیفہ کھلا ہوا ہے سو تو جو چاہے اس میں لکھوا لے، اور جب تو فوت ہو جائے گا تو اسے لپیٹ دیا جائے گا یہاں تک کہ جب تجھے دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو اسے کھولا جائے گا۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ حسن نے کہا ہے: ہر انسان اپنا نامہ عمل پڑھ لے گا چاہے وہ پڑھا ہوا ہو یا نہ پڑھا ہوا ہو (3)۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (آج کے دن تم خود ہی اپنے محاسبے کے لئے کافی ہو۔) اور بعض صلحاء نے کہا ہے: یہ کتاب ہے، تیری زبان اس کی قلم ہے، اور تیرا لعاب اس کی سیاہی ہے، اور تیرے اعضاء اس کے کاغذ ہیں اور تو ہے کہ تو اپنے محافظ فرشتوں (کراما کاتبین)

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 61 2۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 16 3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 18

کو لکھوانے والا ہے نہ اس میں زیادتی اور اضافہ کیا جائے گا اور نہ اس سے کچھ کم کیا جائے گا، اور جب تو اس سے کسی چیز کا انکار کرے گا تو اس بارے میں تجھ سے ہی تیرے خلاف شاہد اور گواہ ہوں گے۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ؕ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ؕ وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝

’’جو راہ ہدایت پر چلتا ہے تو وہ راہ ہدایت پر چلتا ہے اپنے فائدے کے لئے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے، اور نہیں اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ، اور ہم عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ہم نہ بھیجیں کسی رسول کو۔‘‘

قولہ تعالیٰ: مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا یعنی بلاشبہ ہر ایک سے اس کی اپنی ذات کے بارے میں حساب لیا جائے گا کسی دوسرے کے بارے میں نہیں، پس جو راہ ہدایت پر چلتا ہے تو اس کے راہ ہدایت پر چلنے کا ثواب اسی کے لئے ہوگا، اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اس کے کفر (اور نافرمانی) کی سزا اسی پر ہوگی۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی یہ سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس نے اہل مکہ کو کہا تھا: تم میری اتباع کرو اور (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کفر کرو اور تمہارا بوجھ مجھ پر ہوگا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی بلاشبہ ولید تمہارے گناہوں کو نہیں اٹھائے گا بلکہ ہر ایک کا گناہ اس کے اپنے اوپر ہوگا (1)۔ کہا جاتا ہے: وَزَرَ یَزِرُ وِزْرًا وِزْرَةً معنی ہے اس نے گناہ کیا۔ اور الوزر کا معنی ہے بھاری بھرکم بوجھ اور اس کی جمع أوزار ہے، اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ (الانعام: 31) یعنی وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پشتوں پر اٹھائیں گے۔ وَقَدْ وَزَرَ جب وہ اٹھا لے فھو وَازِرٌ (تو وہ اٹھانے والا ہو گیا) اور اسی سے بادشاہ کا وزیر وہ ہوتا ہے جو اس کی مملکت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔ اور قول میں ھا ضمیر النفس سے کنایہ ہے، یعنی کسی گناہ کرنے والے نفس کو دوسرے کے گناہ کے عوض نہیں پکڑا جائے گا، یہاں تک کہ والدہ قیامت کے دن اپنے بیٹے کو کہے گی: اے میرے بچے! کیا میری گود تیرے لئے فرش (بچھونا) نہیں رہی، کیا میری چھاتی تیرے لئے باعث سیرابی نہیں رہی، کیا میرا پیٹ تیرے لئے حفاظت کی جگہ نہیں رہا! تو وہ کہے گا: ہاں (کیوں نہیں) اے میری ماں! تو وہ کہے گی: اے میرے بیٹے! کیونکہ میرے گناہوں نے مجھے بوجھل کر دیا ہے پس تو مجھ سے ان میں سے ایک گناہ اٹھا لے۔ تو وہ کہے گا: اے میری ماں! مجھ سے دور ہو جا کیونکہ آج میں اپنے گناہوں کے سبب تجھ سے مشغول ہوں (یعنی میں تیرا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔)

مسئلہ: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے رد میں دلیل اخذ کی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: بے شک میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کے سبب عذاب دیا جاتا ہے (2)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: ب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 443

2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعذب المیت ببعض بکاء اھلہ، جلد 1، صفحہ 171

شک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اس شے نے اس پر ابھارا ہے کہ وہ یہ ہے جسے آپ نے سنا نہیں، اور دوسرا یہ کہ یہ آیت کے معارض ہے، حالانکہ ان کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ اس معنی کے راوی کثیر ہیں، مثلاً حضرت عمر اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور قیلہ بنت مخرمہ رضی اللہ عنہم۔ اور یہ تمام روایت کے ساتھ یقین رکھنے والے ہیں، ان کے غلطی کرنے کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں ہے، اور آیت اور حدیث کے درمیان کوئی معارضت نہیں ہے، کیونکہ حدیث اس معنی پر محمول ہے جب نوحہ میت کی وصیت سے ہو اور اس کا طریقہ ہو، جیسا کہ وہ جاہلیت میں کرتے تھے۔

یہاں تک کہ طرفہ نے کہا ہے:

إذا مِتّ فانعيني بها أنا أهله		و شُقِّي عليّ الجيب يا بنت معْبَدِ

اور مزید کسی نے کہا:

إلى الحَول ثمّ اسمُ السلام عليكما		و من يَبْكِ حَوْلًا كاملا فقد اعتذر

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت ان میں سے داؤد بھی ہیں وہ ظاہر حدیث کے اعتقاد کی طرف گئے ہیں کہ اسے ان کے نوحہ کے سبب عذاب دیا جاتا ہے، کیونکہ اس نے انہیں اپنی موت سے پہلے اس (نوحہ) سے روکا نہیں، اور اس نے انہیں اس بارے ادب نہیں سکھایا، لہٰذا اسی تفریط کے سبب اسے عذاب دیا جائے گا اور اس ذمہ داری کو ترک کرنے کے سبب اسے عذاب دیا جائے گا جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا (التحریم: 6) (تم بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے۔) نہ کہ کسی دوسرے کے گناہ کے عوض اسے عذاب دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا یعنی ہم نے مخلوق کو مہمل نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ہم نے رسول بھیجے۔ اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ احکام ثابت نہیں ہوتے مگر شریعت کے ساتھ، بخلاف معتزلہ کے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ عقل قبیح اور حسین اور مباح اور ممنوع قرار دیتی ہے۔ اس بارے میں بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ یہ دنیا کے حکم میں ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی امت کو عذاب کے ساتھ ہلاک نہیں کرے گا مگر ان کی طرف رسول اور ڈرانے والے بھیجنے کے بعد۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ دنیا اور آخرت میں عام ہے(1)، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلَّمَاۤ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ ۞ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا (الملک) (جب بھی اس میں کوئی جتھا جھونکا جائے گا تو اس سے دوزخ کے محافظ پوچھیں گے: کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا، وہ کہیں گے: کیوں نہیں، بے شک ہمارے پاس آیا تھا)

ابن عطیہ نے کہا ہے: وہ جس پر نظر وفکر پہنچاتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی بعثت توحید کے ساتھ ہوئی اور آپ نے دلائل قائم کر کے اپنی اولاد میں اعتقادات پھیلائے جو کہ فطرت کی سلامتی کے ساتھ صانع پر دلالت کرتی ہیں اور عالم میں سے ہر ایک پر ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کی شریعت کی اتباع کرنا واجب قرار دیتی ہیں، پھر حضرت نوح علیہ السلام کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 444

زمانہ میں کفار کے غرق ہونے کے بعد تجدید ہوئی، اور اس آیت کے الفاظ یہ احتمال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ان کے بارے میں ہو جن تک کوئی پیغام رسالت نہیں پہنچا، اور وہ زمانہ فترت کے لوگ ہیں جن کے وجود کو بعض اہل علم نے مقدر کیا ہے۔

اور یہ جو روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کی طرف، مجانین (پاگل لوگ) اور بچوں کی طرف (رسول) بھیجے گا یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اور نہ یہ وہ ہے جس کا تقاضا شریعت کرتی ہے کیونکہ آخرت دار تکلیف نہیں ہے (1)۔ مہدوی نے کہا ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اہل فترت، گونگوں اور بہروں کی طرف رسول بھیجے گا پس وہ انہیں وہ کچھ عطا کرے گا جو وہ چاہتا تھا کہ وہ دنیا میں انہیں عطا کرے، اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: اسے معمر نے ابن طاؤس سے، انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اور اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حدیث موقوف ہے، اور عنقریب سورۂ طٰہٰ کے آخر میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اور ایک قوم نے اس بارے میں استدلال کیا ہے کہ اہل جزائر جب اسلام کے بارے میں سنیں اور اس پر ایمان لے آئیں تو جو گزر چکا ہے ان پر اس کی کوئی پابندی نہیں ہے اور یہ صحیح ہے۔ اور جن تک دعوت نہیں پہنچی تو وہ عقلی اعتبار سے عذاب کے مستحق نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ﴿۱۶﴾

"اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہلاک کر دیں کسی بستی کو (اس کے گناہوں کے باعث) تو (پہلے) ہم (نبیوں کے ذریعہ) وہاں کے رئیسوں کو (نیکی کا) حکم دیتے ہیں مگر وہ (الٹا) نافرمانی کرنے لگتے ہیں اس میں، پس واجب ہو جاتا ہے ان پر (عذاب کا) فرمان پھر ہم اس بستی کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں یہ خبر دی ہے کہ وہ رسول بھیجنے سے پہلے کسی بستی کو ہلاک نہیں کرتا، اس لئے نہیں کہ یہ اس کی طرف سے قبیح ہوگا اگر وہ ایسا کرے گا، بلکہ یہ اس کی طرف سے وعدہ ہے، اور وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ پس جب وہ اپنے وعدہ کے اس طرح ثابت ہونے کے ساتھ جس طرح اس نے کہا ہے کسی بستی کو ہلاک اور برباد کرنے کا ارادہ کرے تو وہ وہاں کے رئیسوں کو فسق و فجور اور ظلم و ستم میں لگا دیتا ہے تو پھر ان پر ہلاکت و بربادی کا فرمان حق اور ثابت ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھے یہ بتا رہا ہے کہ جو کوئی ہلاک ہوا بلاشبہ وہ اس کے ارادہ کے ساتھ ہلاک ہوا، پس وہی ہے جو اسباب پیدا کرتا ہے اور انہیں اپنے انجام کی طرف لے جاتا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کا قول سابق ثابت اور متحقق ہو جائے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اَمَرْنَا ابو عثمان نہدی، ابو رجا، ابو العالیہ، ربیع، مجاہد اور حسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے اَمَّرْنَا تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے (2)، یعنی ہم نے وہاں کے شریروں کو مسلط کر دیا پس انہوں نے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 444 2۔ ایضاً

اس میں نافرمانی کی اور فسق و فجور کا ارتکاب کیا، پس جب انہوں نے ایسا کیا تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ اور ابو عثمان نہدی نے کہا ہے: امّرنا یعنی میم کی تشدید کے ساتھ (اس کا معنی ہے) تو ہم ان پر امراء بنا دیتے ہیں درآنحالیکہ وہ ان پر غالب اور مسلط ہوتے ہیں؛ اور یہ ابن عزیز نے کہا ہے اور تأمّر علیھم کا معنی ہے تسلط علیھم (وہ ان پر غالب ہو گیا، قابض ہو گیا) اور حسن نے بھی، قتادہ، ابوحیوہ شامی، یعقوب اور خارجہ نے نافع اور حماد سے انہوں نے ابن کثیر اور علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان دونوں (قراُتوں) کے خلاف پڑھا ہے: آمَرنا یعنی مد اور تخفیف کے ساتھ، یعنی ہم اس کے جابروں اور رئیسوں کو زیادہ کر دیتے ہیں؛ یہ کسائی نے کہا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: آمرتہ مد کے ساتھ ہو اور أمرتہ یہ دونوں لغتیں بمعنی کثّرتہ (میں نے اسے زیادہ کر دیا) ہے اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے خیر المال مُهرةٌ مامورة او سِكّة مابورة۔

یعنی بہترین مال وہ ہے جس کے بچے اور نسل کثیر ہو (1)۔ اور اسی طرح ابن عزیز نے کہا ہے: آمرنا اور أمرنا دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، یعنی اکثرنا (ہم نے زیادہ کر دیا) اور حسن سے بھی اور یحییٰ بن یامر سے اِمرنا بغیر مد اور میم کے کسرہ کے ساتھ فعِلنا کے وزن پر روایت ہے، اور اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے۔ حضرت قتادہ اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اکثرنا اور اسی طرح ابو زید اور ابو عبید نے بیان کیا ہے، اور کسائی نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: کثرت کے معنی میں فقط آمرنا مد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا: اس کی اصل أأمرنا ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی ہے، اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔ اور صحاح میں ہے: اور ابوالحسن نے کہا ہے أمِر مالُه (یعنی میم کے کسرہ کے ساتھ) یعنی اس کا مال زیادہ ہو گیا۔ اور أمِر القوم یعنی قوم بڑھ گئی، زیادہ ہو گئی۔

شاعر نے کہا ہے:

أَمِرون لا يرثون سَهمَ القُعْدُدِ

(وہ کثیر ہیں وہ قلیل الآباء کے حصے کے وارث نہیں ہو سکتے)

اور آمر الله ماله (مد کے ساتھ) (اللہ تعالیٰ نے اس کا مال زیادہ کر دیا)۔ ثعلبی نے کہا ہے: کثیر شی کو أمِرٌ کہا جاتا ہے، اور اس سے فعل آتا ہے: أمِرَ القومُ يأمَرون أمرا جب قوم زیادہ ہو جائے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جب دور جاہلیت میں کوئی قبیلہ زیادہ ہو جاتا تو ہم اس کے لئے کہتے تھے: أمِر أمرُ بني فلان (بنی فلاں کی تعداد بڑھ گئی)۔

جیسا کہ لبید نے کہا ہے:

كل بنی حُرّةٍ مَصيرُهُم	قُلٌّ وإن أكثرت من العددِ
إن يُغْبَطُوا يَهْبِطوا وإن أَمِرُوا	يوما يصيروا للهُلْكِ والنَّكَدِ(2)

تو اس میں أمِرُوا کثرت کے معنی میں ہی استعمال ہو رہا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہرقل کی حدیث میں ہے اور وہ حدیث صحیح ہے: لقد أمِر أمْرُ ابن ابی کبشہ، لیخافہ ملک بنی

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1196 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 236

الأصفر، ای کثر (یعنی ابن ابی کبشہ (مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) کی تعداد زیادہ ہوگئی تا کہ بنی اصفر کا حاکم اس سے خوفزدہ ہو جائے۔) اور یہ سب غیر متعدی ہیں اسی لئے کسائی نے اس کا انکار کیا ہے، واللہ اعلم۔ مہدوی نے کہا ہے: جس نے أمِر پڑھا ہے تو وہ بھی ایک لغت ہے، اور أمِرکے متعدی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عَمِر کے مشابہ ہے اس حیثیت سے کہ کثرت کسی شے کو عمارۃ (آبادی) کے زیادہ قریب کرنے والی ہے پس یہ عَمِر کے متعدی ہونے کی طرح متعدی ہوا۔ اور باقیوں نے اَمَرْنَا، الأمر سے بنایا ہے، یعنی ہم نے انہیں اطاعت کے بارے حکم دیا الزام سے برأت کے لئے، خوفزدہ کرنے کے لئے اور وعید سناتے ہوئے۔ فَفَسَقُوْا یعنی وہ ہماری نافرمانی کرتے ہوئے ہماری اطاعت سے نکل گئے۔ فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ پس ان پر وعید (ہلاکت وبربادی) واجب ہوگئی، ثابت ہوگئی؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَمَرْنَا یعنی ہم نے انہیں امراء بنا دیا، کیونکہ عرب کہتے ہیں: أمیر غیر مأمور یعنی امیر وہ ہے جس پر کوئی امیر نہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ہم نے اس کے تکبر کرنے والوں کو بھیج دیا۔ ہارون نے کہا ہے: اور یہ حضرت ابی کی قرأت ہے: ''ہم نے اس میں بڑے بڑے مجرم بھیج دیئے اور انہوں نے فسق و فجور کا ارتکاب کیا۔'' اسے ماوردی نے بیان کیا ہے۔

اور نحاس نے بیان کیا ہے: اور ہارون نے ابی کی قرأت میں کہا ہے: اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس میں اس کے بڑے بڑے مجرم بھیج دیتے ہیں پس وہ اس میں مکروفریب کرتے ہیں تو اس پر (عذاب کا) فرمان واجب ہو جاتا ہے۔ واذا أردنا أن نهلك قرية بعثنا فيها أكابر مجرميها فمكروا فيها فحق عليها القول، اور یہ بھی جائز ہے کہ أمَرْنا بمعنی اکثرنا ہو، اور اسی سے خیر المال مهرة مأمورة (1) ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: مامورۃ مأبورۃ کے تابع ہے، جیسا کہ الغدایا والعشایا ہیں اور جیسا کہ آپ کا یہ قول ہے: ارجعن مأزورات غیر مأجورات (2) (گناہ کرنے والیاں بغیر کسی اجر کے لوٹ جائیں۔) اور اس بنا پر یہ نہیں کہا جاتا: امرهم الله، بمعنی کثرهم (اللہ تعالیٰ نے انہیں زیادہ کر دیا)، بلکہ یہ کہا جائے گا: آمرہ اور أمرہ (اس نے اسے زیادہ کر دیا) اور ابو عبید اور ابو حاتم نے قرأت عامہ کو اختیار کیا ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: بلاشبہ ہم نے امرنا کو اختیار کیا ہے کیونکہ أمر، امارت اور کثرت میں سے تینوں معنی اس میں جمع ہیں اور المترف سے مراد خوشحال اور رئیس ہے اور انہیں أمر کے ساتھ خاص اس لئے کیا ہے کیونکہ ان کے سوا دوسرے لوگ ان کے تابع ہوتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَدَمَّرْنٰهَا یعنی ہم ہلاکت کے سبب اسے جڑ سے اکھیڑ دیتے ہیں۔ تَدْمِيْرًا مصدر کا ذکر ان پر واقع ہونے والے عذاب میں مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے۔ اور صحیح میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا جو کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ہیں ان کی حدیث ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اس حال میں کہ

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1196

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، ماجاء فی اتباع النساء الجنائز، صفحہ 144

آپ گھبرائے ہوئے تھے اور آپ کا چہرہ سرخ تھا آپ فرمانے لگے: "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں عربوں کے لئے ہلاکت اور بربادی ہے اس شر سے جو قریب آچکا ہے آج یاجوج ماجوج کی دیوار سے اتنا سا سوراخ ہو گیا ہے" (1)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی سے حلقہ سا بنایا۔ آپ فرماتی ہیں: تو میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم ہلاک ہو جائیں (2) گے حالانکہ ہم میں صالحین موجود ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں جب خبث (پلیدی) بڑھ جائے گا"۔ اس بارے میں کلام پہلے گزر چکی ہے۔ بے شک گناہ اور معاصی جب ظاہر ہو جائیں اور انہیں تبدیل نہ کیا جائے تو وہ تمام کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ۝۱۷

"اور کتنی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ہے نوح کے بعد، اور آپ کا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے اچھی طرح باخبر ہے (اور انہیں) خوب دیکھنے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ یعنی کتنی قومیں ہیں جنہوں نے کفر کیا اور ان پر ہلاکت و بربادی آئی۔ (اللہ تعالیٰ) کفار مکہ کو ڈرا رہا ہے اور قرن کے بارے میں سورۃ الانعام میں کلام گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا، خَبِيْرًا یعنی آپ کا رب اپنے بندوں کے گناہوں کو جاننے والا ہے۔ بَصِيْرًا (اور) ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝۱۸ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝۱۹

"اور جو لوگ طلبگار ہیں صرف دنیا کے ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں، پھر ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لئے جہنم تاپے گا وہ اسے اس حال میں کہ وہ مذمت کیا ہوا (اور) ٹھکرایا ہوا ہوگا، اور جو شخص طلبگار رہتا ہے آخرت کا اور جدوجہد کرتا ہے اس کے لئے پوری طرح درآنحالیکہ وہ مومن بھی ہو، پس یہ وہ (خوش نصیب ہیں) جنکی کوشش مقبول ہوگی۔"

قولہ تعالیٰ: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ مراد دنیا ہے، اور مراد الدار العاجلة (یعنی جو لوگ طلبگار ہیں صرف دار دنیا کے)، تو اس میں منعوت کو نعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ یعنی ہم اس میں سے اسے عطا نہیں کرتے مگر جو ہم چاہتے ہیں پھر ہم اس کے عمل کے مطابق اس کا مواخذہ کریں گے، اور اس کا انجام جہنم میں داخل ہونا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویل للعرب من شر قد اقترب، جلد 2، صفحہ 1046 2۔ ایضاً

مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا یعنی اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھگایا ہوا اور دور کیا ہوا ہوگا اور یہ فاسق منافقوں کی صفت ہے، اور ان ریاکاری اور دکھاوا کرنے والوں کی جو اندر کینہ چھپا کر ظاہرداری کرتے ہیں، وہ اسلام اور طاعت کا لبادہ اوڑھتے ہیں تا کہ وہ جلدی ملنے والی دنیا کے منافع اور فوائد وغیرہ کو حاصل کریں، پس آخرت میں ان سے وہ عمل قبول نہیں کیا جائے گا اور دنیا میں انہیں صرف وہ دیا جائے گا جو ان کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ اور سورۂ ہود میں یہ گزر چکا ہے کہ یہ آیات ان آیات مطلقہ کو مقید کر رہی ہے، پس تو اس میں غور کر لے۔ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ یعنی اور جو دار آخرت کے طلبگار ہیں۔ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا یعنی اس نے طاعات وعبادات میں سے جو عمل کئے وہ آخرت کے لئے کئے۔ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ کیونکہ طاعات وعبادات قبول نہیں کی جاتیں مگر مومن سے۔ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعۡيُهُمۡ مَّشۡكُوۡرًا پس ان کی سعی وکوشش مقبول ہوگی مردود نہیں ہوگی۔ اور کہا گیا ہے: مضاعفًا یعنی ان کے لئے نیکیوں کو دس گنا تک اور ستر گنا تک، اور سات سو گنا تک، (بلکہ) کثیر گنا تک بڑھا دیا جائے گا، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے تحقیق انہیں کہا گیا: کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر ہزار ہزار نیکی کا بدلہ اور جزا دیتا ہے؟'' تو انہوں نے جواب دیا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر دو لاکھ گنا تک نیکیوں کا ثواب اور جزا عطا فرماتا ہے۔''

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا ۝۲۰
اُنۡظُرۡ كَيۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ۚ وَلَلۡاٰخِرَةُ اَكۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكۡبَرُ تَفۡضِيۡلًا ۝۲۱
لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقۡعُدَ مَذۡمُوۡمًا مَّخۡذُوۡلًا ۝۲۲

''ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں ان کی بھی (جو طالب دنیا ہیں) اور ان کی بھی (جو طالب آخرت ہیں) آپ کے رب کی بخششوں سے، اور آپ کے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں۔ دیکھو! کیسے بزرگی دی ہے ہم نے بعض کو بعض پر اور آخرت باعتبار درجوں کے سب سے بڑی اور باعتبار فضل وکرم کے سب سے اعلیٰ ہے۔ نہ ٹھہراؤ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ورنہ تم بیٹھ رہو گے اس حال میں کہ تمہاری مذمت کی جائے گی اور بے یار ومددگار ہو جاؤ گے۔''

قولہ تعالیٰ: كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّكَ تو یہ جان لے کہ وہ مومنوں اور کافروں سبھی کو رزق دیتا ہے۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحۡظُوۡرًا یعنی آپ کے رب کی عطا کسی کے لئے ممنوع اور بند نہیں ہے: محظور یہ حَظَرَ يَحۡظُرُ حَظۡرًا و حِظَارًا سے ماخوذ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُنۡظُرۡ كَيۡفَ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ دیکھو! ہم نے رزق اور عمل میں بعض کو بعض پر کیسے فضیلت دی، پس ان میں سے تنگ دست بھی ہیں اور خوشحال ودولتمند بھی (اسی طرح عمل کے اعتبار سے کچھ کمزور ہیں اور کچھ اعلیٰ۔) وَلَلۡاٰخِرَةُ اَكۡبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكۡبَرُ تَفۡضِيۡلًا یعنی مومنوں کے لئے آخرت باعتبار درجوں کے سب سے بڑی اور باعتبار فضل وکرم کے سب سے اعلیٰ ہے اور وہ کافر تو اگرچہ دنیا میں اسے ایک بار وسعت دی گئی، اور مومن پر ایک بار تنگی آئی لیکن آخرت ان کے اعمال کے اعتبار سے صرف ایک بار تقسیم کی جائے گی، پس جس سے کوئی شے ایک بار فوت ہو گئی تو پھر وہ اسے اس میں نہیں پا سکے گا۔ اور قول باری تعالیٰ: لَا تَجۡعَلۡ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ

ہی امت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب انسان کو ہے (کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ ٹھہراؤ)۔ فَتَقْعُدَ ورنہ تم باقی رہو گے۔ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا اس حال میں کہ نہ تمہارا کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی دوست۔

وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِیْمًا ۝ وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا ۝

''اور حکم فرمایا آپ کے رب نے کہ نہ عبادت کرو بجز اس کے اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اگر بڑھاپے کو پہنچ جائے تیری زندگی میں ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں تو انہیں اف تک مت کہو اور انہیں مت جھڑکو، اور جب ان سے بات کرو تو بڑی تعظیم سے بات کرو۔ اور جھکا دو ان کے لئے تواضع وانکسار کے پر رحمت (ومحبت) سے اور عرض کرو: اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحم فرما جس طرح انہوں نے (بڑی محبت و پیار سے) مجھے پالا تھا جب میں بچہ تھا۔''

اس میں سولہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قَضٰى اس کا معنی ہے اَمَرَ (تیرے رب نے حکم دیا)، الزم (اس نے لازم کیا) اور اَوْجَبَ (اس نے واجب کیا) حضرت ابن عباس، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے: یہ قضا حکم نہیں ہے بلکہ یہ قضا امر ہے۔ اور مصحف حضرت ابن مسعود میں وَوَصّٰى ہے اور یہی آپ کے اصحاب کی قرأت ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے، اور اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے نزدیک ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: بلاشبہ یہ وَوَصّٰى ربك ہے پس دو واؤں میں سے ایک کو قاف سے بدل دیا اور اسے وَقَضٰى رَبُّكَ پڑھا گیا کیونکہ اگر یہ قضا (حکم) ہوتا تو پھر کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور حکم عدولی نہ کرتا۔ اور ضحاک نے کہا ہے: ایک قوم پر مصحف لکھتے وقت تصحیف ہوتی جس وقت واؤ صاد سے تھ ملی دصی بقضی (یعنی دصی کو قضی سے بدل دیا) ابو حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضحاک کے قول کی مثل ہی ذکر کیا ہے۔ اور میمون بن مہران سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: بے شک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر دلیل موجود ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ (الشوریٰ: 13) (اس نے مقرر فرمایا ہے تمہارے لئے وہ دین جس کا اس نے حکم دیا تھا اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ کی طرف) پھر ابو حاتم نے انکار کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ کہا ہو۔ اور کہا: اگر ہم یہ کہیں تو پھر زنادقہ ہمارے مصحف کے بارے میں طعن کریں گے۔ پھر ہمارے علمائے متکلمین وغیرہ نے کہا ہے: لفظ قضا لغت میں کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، پس قضا بمعنی امر ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ یعنی تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ تم عبادت نہ کرو مگر اسی کی۔ اور قضا بمعنی خلق (پیدا کرنا) ہے؛ جیسے قول باری تعالیٰ ہے: فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ (فصلت: 12) یعنی اس نے انہیں دو دنوں میں تخلیق فرمایا۔

اور قضا بمعنی حکم (فیصلہ کرنا) ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (طٰہٰ: 72) یعنی تو فیصلہ کر جو تو فیصلہ کرتا ہے۔ اور قضا بمعنی الفراغ (فارغ ہونا) ہے؛ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ (یوسف) (امل) فیصلہ ہو چکا اس بات کا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو۔ یعنی وہ اس سے فارغ ہوا۔ اور اسی معنی میں یہ قول باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (البقرہ: 200) (پھر جب تم پورے کر چکو حج کے ارکان) ل باری تعالیٰ ہے: فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ (الجمعہ: 10) (پھر جب پوری ہو چکے نماز)۔

اور قضا بمعنی ارادہ بھی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (غافر) (جب فیصلہ فرماتا ہے کسی کام (کے کرنے) کا تو بس اتنا ہی کہتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے) اور قضا بمعنی عہد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ (القصص: 44) (اور آپ نہیں تھے (طور) کی مغربی سمت میں جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف (حکم بھیجا)، تو جب قضا ان معانی کا احتمال رکھتا ہے تو پھر اس قول کا اطلاق جائز نہیں ہے کہ معاصی اللہ تعالیٰ کی قضا سے ہوتی ہیں، کیونکہ اگر اس سے امر مراد لیا جائے تو پھر اس کے جائز نہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان (معاصی) کے بارے میں حکم نہیں دیا، کیونکہ وہ فحشاء (برائیوں) کے بارے حکم نہیں دیتا۔ اور زکریا بن سلام نے کہا ہے: ایک آدمی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا بے شک اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے اور وہ تجھ سے جدا ہو گئی ہے، تو اس آدمی نے کہا: (کیا) اللہ تعالیٰ نے میرے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے؟ تو حضرت حسن نے فرمایا حالانکہ آپ بڑے فصیح تھے: ماقضی اللہ ذالك یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے حکم نہیں دیا۔ اور پھر یہ آیت پڑھی: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی عبادت اور اپنی توحید کے بارے حکم ارشاد فرمایا، اور والدین کے ساتھ نیکی کرنے کو اس کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے، جیسا کہ آپ نے ان دونوں کا شکر ادا کرنے کو اپنے شکر کے ساتھ ملایا ہے اور فرمایا ہے: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اور فرمایا: اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ (لقمان) (کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا (آخر کار) میری طرف ہی (تمہیں) لوٹنا ہے)۔

اور صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ''نماز اپنے وقت پر ادا کرنا''۔ عرض کی: پھر کون سا عمل؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا''۔ عرض کی: پھر کون سا عمل؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا'' (1)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی کہ والدین کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرنا اس نماز کے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، ووصينا الانسان بوالديه، جلد 2، صفحہ 882

بعد افضل ترین عمل ہے جو اسلام کے ارکان میں سے سب سے عظیم رکن ہے۔ اور اسے اس ثُمّ کے ساتھ مرتب کیا جو ترتیب اور مہلت کا فائدہ دیتا ہے۔ (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''الصلوٰۃ علی وقتھا'' قال ثم ای؟ قال ''ثم برّ الوالدین'' قال ثم ای؟ قال ''الجھاد فی سبیل اللہ''۔

مسئلہ نمبر 3۔ والدین کے ساتھ نیکی کرنا اور ان کے ساتھ احسان سے پیش آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ گالی گلوچ کرتے ہوئے تعرض اور چھیڑ چھاڑ نہ کرے اور نہ ان کی نافرمانی کرے، کیونکہ بلا اختلاف یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ اور اس کے بارے سنت ثابتہ (صحیحہ) موجود ہیں، پس صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک کبیرہ گناہوں میں سے کسی آدمی کا اپنے والدین کو گالی دینا ہے۔'' صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا کوئی آدمی اپنے والدین کو گالیاں دے سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں''۔ ایک آدمی کسی دوسرے کے باپ کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے اور ایک آدمی دوسرے کی ماں کو گالی دیتا ہے تو وہ اس کی ماں کو گالیاں دیتا ہے۔'' (انّ من الکبائر شتم الرجل والدیہ قالوا: یا رسول اللہ، و ھل یَشْتُمُ الرجل والدیہ؟ قال نعم، یسبّ الرجل أبا الرجل فیَسُبّ أباہ و یَسُبّ أُمّہ فیسبّ امّہ) (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ عقوق الوالدین (والدین کی نافرمانی) ان کی جائز اغراض میں ان کی مخالفت کرنا ہے، جیسا کہ ان کے ساتھ نیکی کرنے کا معنی ان کی اغراض میں ان کے ساتھ موافقت کرنا ہے۔ اس بنا پر جب وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک اپنی اولاد کو کسی کام کے بارے حکم دیں تو اس بارے میں ان کی اطاعت کرنا واجب ہے، جب وہ امر معصیت اور گناہ کا نہ ہو، اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ مامور بہ مباح کے قبیلے سے ہو، اسی طرح حکم ہے جب وہ مندوب کے قبیل سے ہو۔ اور بعض لوگوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مباح کے بارے ان دونوں کا حکم دینا اولاد کے حق میں وہ اسے مندوب بنا دیتا ہے اور ان دونوں کا مندوب کے بارے حکم دینا اس کے مندوب ہونے میں مزید تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میرے عقد میں ایک عورت تھی میں اسے پسند کرتا تھا، اور میرے والد (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) اسے ناپسند کرتے تھے پس انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اسے طلاق دے دوں تو میں نے انکار کر دیا، پھر میں نے یہ واقعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا: ''اے عبداللہ ابن عمر! تو اپنی بیوی کو طلاق دے دے (2)''۔ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے (3) کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: لوگوں میں سے کون میرے حسن سلوک کا زیادہ مستحق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تیری ماں''۔ اس نے عرض کی: پھر کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پھر تیری ماں ہے''۔ اس نے عرض کی: پھر کون ہے؟

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الکبائر و اکبرھا، جلد 1، صفحہ 64

2۔ جامع ترمذی، کتاب الطلاق، ماجاء فی الرجل یسألہ ابوہ أن یطلق امراتہ، جلد 1، صفحہ 142، ایضاً، حدیث 1110، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلہ و الادب، بر الوالدین و انھما أحق بہ، جلد 2، صفحہ 312

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر تیری ماں ہے''۔ اس نے عرض کی: اس کے بعد کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر تیرا باپ ہے''۔ پس یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ماں کی محبت اور اس پر شفقت باپ کی محبت کی تین مثل ہونی چاہئے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کا ذکر تین بار فرمایا اور باپ کا ذکر صرف چوتھی بار فرمایا۔ اور جب اس معنی کو جوڑا جائے تو اس کے کئی شواہد مل جاتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ حمل کی صعوبت اور اسے وضع کرنے کی تکلیف، اور دودھ پلانے اور تربیت کرنے کی صعوبت (ایسی چیزیں ہیں) جن کے ساتھ باپ کے سوا ماں منفرد ہوتی ہے، پس یہی وہ تین منازل ہیں جن سے باپ علیحدہ اور خالی ہوتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ان سے ایک آدمی نے کہا: میرا باپ سوڈان میں ہے، اور اس نے میری طرف لکھا ہے کہ میں اس کے پاس آؤں، اور میری ماں مجھے اس سے منع کر رہی ہے، تو آپ نے اسے فرمایا: تو اپنے باپ کی اطاعت کر، اور اپنی ماں کی نافرمانی نہ کر۔

پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول اس پر دلیل ہے کہ ان کے نزدیک دونوں کے ساتھ نیکی کرنا اور احسان کرنا برابر ہے۔ تحقیق حضرت لیث رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے اسے ماں کی اطاعت و پیروی کرنے کا حکم دیا اور یہ گمان کیا کہ ماں کے لئے نیکی اور احسان کے دو ثلث ہیں۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ماں کے لئے نیکی اور احسان کے تین چوتھائی ہیں اور یہی اس کے خلاف حجت ہے جس نے اختلاف کیا ہے۔ اور محاسبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب الرعایہ'' میں یہ بیان کیا ہے کہ علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ماں کے لئے نیکی اور احسان کے تین چوتھائی اور باپ کے لئے ایک چوتھائی ہے؛ اور یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے مقتضا کی بنا پر ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 7۔ والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کرنا اس کے ساتھ مختص نہیں ہے کہ وہ دونوں مسلمان ہوں، بلکہ اگر وہ کافر بھی ہوں تب بھی وہ ان سے نیکی کرے گا اور حسن سلوک سے پیش آئے گا جب ان کے لئے کوئی معاہدہ اور امان ہو، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ لَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ (الممتحنہ: 8) (اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو)۔

اور صحیح بخاری میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میری ماں آئی اور وہ مشرکہ تھی قریش کے عہد اور ان کی مدت میں جب کہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کیا تھا (وہ) اپنے باپ کے ساتھ آئی، تو میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا اور عرض کی: بے شک میری ماں آئی ہے اور وہ رغبت رکھتی ہے کیا میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں تو اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر (1)''۔ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے ہی یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد (2) میں میری ماں رغبت رکھتے ہوئے میرے پاس آئی تو میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں اس سے صلہ رحمی کر سکتی ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' ابن

1۔ صحیح بخاری، کتاب الأدب، صلة المرأة امها ولها زوج، جلد 2، صفحہ 884 2۔ ایضاً، کتاب الأدب، صلة لوالد المشرك، جلد 2، صفحہ 884

عیینہ نے کہا ہے: پس اللہ عزوجل نے انہی کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی ہے: لَا یَنۡهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡكُمۡ فِی الدِّیۡنِ (الممتحنہ:8)

پہلی روایت معلق ہے اور دوسری مسند ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ ان دونوں کے ساتھ احسان اور نیکی میں سے یہ بھی ہے کہ جب جہاد متعین (فرض عین) نہ ہو تو وہ ان کی اجازت کے بغیر جہاد پر نہ جائے۔ صحیح میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ سے جہاد میں جانے کی اجازت طلب کرنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟'' اس نے کہا: جی ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پس تو ان دونوں (کی خدمت) میں رہ اور جہاد کر (1)''۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ اور غیر صحیح میں الفاظ یہ ہیں اس نے کہا: جی ہاں، میں نے انہیں روتے ہوئے چھوڑا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو جا اور انہیں ہنسا جیسا کہ تو نے انہیں رلایا ہے (2)''۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرا اپنے والدین کے ساتھ ان کے بستر پر سونا کہ وہ تیرے ساتھ ہنسی مزاح کریں اور تیرے ساتھ دل بہلائیں یہ تیرے لئے میرے ساتھ جہاد پر جانے سے افضل ہے۔'' اسے ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے۔ اور بخاری کے الفاظ ''کتاب برالوالدین'' میں یہ ہیں ہمیں ابونعیم نے خبر دی اور سفیان نے ہمیں عطاء بن سائب سے انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے خبر دی کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا کہ وہ آپ کی ہجرت پر بیعت کرنا چاہتا ہے، اور اس نے اپنے والدین کو روتے ہوئے چھوڑا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو ان کی طرف لوٹ جا اور تو انہیں اسی طرح ہنسا جیسے تو نے انہیں رلایا ہے۔'' ابن منذر نے کہا ہے: اس حدیث میں والدین کی اجازت کے بغیر نکلنے سے منع کیا گیا ہے جب تک نفیر عام نہ ہو، اور جب (حاکم وقت کی جانب سے) جہاد کے لئے اعلان عام ہو جائے تو پھر تمام پر نکلنا واجب ہے۔

اور یہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بالکل بین اور واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیش الامراء بھیجا...... اور حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر بن ابی طالب، اور حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہم کا قصہ بیان کیا اور یہ کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے اعلان کیا کہ نماز تیار ہے (الصلوٰۃ جامعۃ)، پس لوگ جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! نکلو اور اپنے بھائیوں کی مدد کرو اور کوئی پیچھے نہ رہے۔'' پس لوگ شدید گرمی میں پیدل چلتے ہوئے اور سوار ہو کر نکلے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: اخرجوا فامدوا اخوانکم اس پر دلیل ہے کہ جہاد سے پیچھے رہنے کا عذر اس وقت تک ہے جب تک نفیر عام نہ ہو، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے: فَاِذَا استنفرتم

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ و الأدب، تقدیم بر الوالدین، جلد 2، صفحہ 313

ایضاً سنن ابن ماجہ، باب الرجل یغزو الخ، حدیث نمبر 2771، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجهاد، باب الرجل یغزو وله ابوان، صفحہ 205

فانفروا(1) (پس جب تم سے مدد طلب کی جائے تو مدد کیا کرو)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ تمام احادیث اس پر دلیل ہیں کہ فرائض اور مستحبات جب جمع ہو جائیں تو پھر ان میں سے اہم کو مقدم کیا جائے۔ یہ بحث مکمل طور پر محاسبی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب ''الرعایۃ'' میں بیان کی ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ مشرک والدین کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ان کی اجازت کے ساتھ نکلا جائے گا جب کہ جہاد فروض کفایہ میں سے ہے، تو امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: آدمی ان کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: آدمی کے لئے جائز ہے کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک ہو۔ ابن منذر نے کہا ہے: دادے بھی باپ ہیں اور دادیاں بھی مائیں ہیں پس آدمی ان کی اجازت کے بغیر جہاد میں شریک نہیں ہوگا اور میں کوئی دلیل نہیں جانتا جو ان کے علاوہ بھائیوں اور دیگر تمام رشتہ داروں میں سے کسی کے لئے یہ حکم ثابت کرتی ہو۔ اور طاؤس رحمۃ اللہ علیہ بہنوں کے بارے میں کوشش اور دوڑ دھوپ کرنا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے سے افضل گمان کرتے تھے۔

مسئلہ نمبر 10۔ والدین کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی کی تکمیل میں سے ان کے دوستوں اور چاہنے والوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا ہے، پس صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بے شک بہترین نیکی آدمی کا اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ صلہ رحمی کرنا ہے اس کے بعد کہ وہ پیٹھ پھیر لے(2)''۔ (یعنی باپ فوت ہو جائے) حضرت ابو اسید رضی اللہ عنہ نے روایت ذکر کی ہے اور یہ بدری صحابی تھے۔ فرمایا: میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ انصار میں سے ایک آدمی آپ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا میرے والدین کے فوت ہونے کے بعد نیکی اور احسان میں سے کوئی شے باقی ہے جس کے ساتھ میں ان دونوں کے ساتھ نیکی اور احسان کر سکوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں''، ان پر نماز جنازہ پڑھنا، ان کیلئے استغفار کرنا، ان کے بعد ان کے وعدہ کو پورا کرنا، ان کے دوستوں کی تکریم کرنا اور ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا جن کے ساتھ تیرا تعلق صرف انہیں کی جانب سے ہو پس یہی وہ امور ہیں جو تجھ پر باقی ہیں۔'' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کی طرف ان کے ساتھ نیکی اور وفا کرتے ہوئے تحائف بھیجا کرتے تھے حالانکہ آپ رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیقۂ حیات ہیں، تو پھر والدین کے بارے تیرا کیا خیال ہے(3)۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا یہاں بڑھاپے کی حالت کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ وہ حالت ہے جس میں وہ دونوں آدمی کے احسان اور نیکی کے محتاج ہوتے ہیں کیونکہ ضعف اور بڑھاپے کی وجہ سے ان کی حالت اور کیفیت تبدیل ہو چکی ہوتی ہے، پس اس حالت میں ان دونوں کے احوال کا لحاظ رکھنا (اور ان کی

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، المبایعۃ بعد فتح المکۃ علی الاسلام والجہاد، جلد 2، صفحہ 130

2۔ ایضاً، کتاب البر والصلۃ والادب۔ فضل الصلۃ اصدقاء الاب والام ونحوھما، جلد 2، صفحہ 314

3۔ سنن ابی داؤد، باب فی برالوالدین، حدیث 4476، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دیکھ بھال کرنا) اس سے زیادہ لازم قرار دی ہے جتنی اس سے پہلے لازم کی ہے، کیونکہ وہ اس حالت میں اس پر بھاری ہو گئے ہیں پس وہ بڑھاپے میں اس شے کے ملنے کے محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہیں جس کا وہ اپنے بچپن اور صغر سنی میں محتاج تھا کہ وہ اس سے وہ برتاؤ کریں، پس یہی وجہ ہے کہ ذکر کے ساتھ اسی حالت کو خاص کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہ طویل مدت تک آدمی کا ٹھہرے رہنا عادۃً آدمی کے لئے بوجھل اور گراں ہو جاتا ہے اور اکتاہٹ حاصل ہو جاتی ہے اور تنگی بڑھ جاتی ہے پس اس کا غصہ اپنے والدین پر ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کی رگیں ان کے لئے پھولنے لگتی ہیں، اور بیٹا ہونے کے ناطے سے اس کا جرأت کرنا اور دیانت کا کم ہونا ان دونوں پر گراں گزرتا ہے، اور کم سے کم مکروہ اور ناپسندیدہ وہ ردیہ ہے جو تنگی اور پریشانی سے اس کی سانس کے مضطرب اور متردد ہونے کے سبب ظاہر ہوتا ہے، حالانکہ حکم یہ دیا گیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ایسی گفتگو اور قول کرے جو عزت و کرامت کے ساتھ متصف ہو، اور وہ ہر عیب سے محفوظ و مامون ہو پس ارشاد فرمایا: **فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا**۔ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (1) سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کی ناک خاک آلود ہو'' عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کس کی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے والدین میں سے ایک یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پایا پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا'' اور بخاری نے ''کتاب برالوالدین'' میں بیان کیا ہے، مسدد نے ہمیں بیان کیا (انہوں نے کہا) بشر بن مفضل نے ہمیں بیان کیا (انہوں نے کہا) عبدالرحمن بن اسحاق نے ابو سعید مقبری سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا، اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس نے اپنے والدین یا ان میں سے ایک کو اپنے پاس بڑھاپے کی حالت میں پایا اور انہوں نے اسے جنت میں داخل نہ کیا، اور اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس پر رمضان المبارک کا مہینہ آیا پھر وہ اس سے پہلے گزر گیا کہ اس کی مغفرت کی جائے (2)''۔

ابن ابی اویس نے ہمیں بیان کیا ہے کہ میرے بھائی نے سلیمان بن بلال سے، انہوں نے محمد بن ہلال سے، انہوں نے سعد بن اسحاق بن کعب بن عجرہ سالمی سے اور انہوں نے اپنے باپ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: بے شک حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''منبر لاؤ'' پس جب آپ باہر تشریف لائے تو منبر پر تشریف لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو فرمایا: ''امین'' پھر دوسرے زینہ پر چڑھے تو فرمایا: ''امین'' پھر تیسرے زینہ پر بلند ہوئے تو فرمایا: ''آمین''، پس جب آپ فارغ ہوئے اور منبر سے نیچے تشریف لائے تو ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق آج ہم نے آپ سے وہ شے سنی ہے جو پہلے ہم آپ سے نہیں سنتے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم نے اسے سنا ہے''؟ ہم نے عرض کی: جی ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک حضرت جبرائیل علیہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب۔ فضل الصلۃ اصدقاء الاب والام ونحوھما، جلد 2، صفحہ 314

2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، ماجاء فی جامع الدعوات النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 671

السلام پیش ہوئے اور کہا: وہ (اللہ کی رحمت سے) دور ہو جس نے رمضان المبارک کو پایا اور اس کی مغفرت نہ کی گئی تو میں نے کہا آمین۔ اور جب میں دوسری سیڑھی پر چڑھا تو انہوں نے کہا وہ دور ہو جس کے پاس آپ کا ذکر کیا گیا اور اس نے آپ پر درود پاک نہ پڑھا تو میں نے کہا: آمین۔ اور جب میں تیسرے زینے پر بلند ہوا تو انہوں نے کہا وہ (اللہ کی رحمت سے) دور ہوا جس نے اپنے پاس اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور انہوں نے اسے جنت میں داخل نہ کیا تو میں نے کہا: آمین (1)"۔

ابونعیم نے ہمیں بیان کیا ہے (انہوں نے کہا) ہمیں سلمہ بن وردان نے بیان کیا ہے میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر ایک سیڑھی چڑھے تو فرمایا: "آمین"۔ پھر دوسری سیڑھی چڑھے تو فرمایا: "آمین" پھر تیسری سیڑھی چڑھے تو فرمایا: "آمین"، پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے تو آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے آمین کس پر کہی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور انہوں نے کہا: اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کے پاس آپ کا ذکر کیا جائے اور وہ آپ پر درود پاک نہ پڑھے تو میں نے کہا: آمین، اور اس کی ناک خاک آلود ہو جس نے اپنے والدین یا ان میں سے ایک کو پایا اور وہ جنت میں داخل نہ ہوا تو میں نے کہا: آمین (2)" الحدیث۔ پس سعادت مند وہ ہے جو ان کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کی فرصت کو غنیمت جانتا ہے تاکہ وہ ان کی موت کے سبب اس سے فوت نہ ہو جائے کہ پھر وہ اس پر نادم اور شرمندہ ہو۔ اور شقی (بدبخت) وہ ہے جس نے ان کی نافرمانی کی، بالخصوص وہ جس تک ان کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کا حکم پہنچا ہوا ہو۔

مسئلہ نمبر 12۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ یعنی تم انہیں اتنا بھی نہ کہو جس میں معمولی سا بھی زچ کرنا ہو۔ ابورجا عطاردی نے کہا ہے: الاُف سے مراد وہ کلام ہے جو فحش، ردی اور خفی ہو۔ اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے جب تو انہیں بڑھاپے کی حالت میں اس بول و براز میں دیکھے جو انہوں نے طفولیت کی حالت میں دیکھا تو تو انہیں گندہ خیال نہ کر (اور ان سے گھن نہ کر) کہ تو کہے: اف۔ اور آیت اس سے عام ہے۔ اور اف اور تف سے مراد ناخنوں کی میل کچیل ہے۔ اور ہر وہ شے جو بے چین اور تنگ کرتی ہے اور ثقیل سمجھی جاتی ہے اس کے لئے اُف کہا جاتا ہے۔ ازہری نے کہا: الثُّفُ سے حقیر شے بھی مراد ہے۔ اور اُفٍ کو منون اور مجرور پڑھا گیا ہے، جیسا کہ اُصوات (آوازیں) کو جر دی جاتی ہے اور انہیں تنوین کے ساتھ پڑھا جاتا ہے جب آپ کہتے ہیں: صَہٍ اور مَہٍ۔ اور اس میں دس لغات ہیں: اُفّ، اُفُّ، اُفِّ، اُفًّا، اُفٍّ، اُفٌّ، اُفَّۃ، اِفّ لک (ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ) اُف (ہمزہ اور فا کے سکون کے ساتھ اور اُفَا (یعنی فاء کی تخفیف کے ساتھ)۔

اور حدیث میں ہے: "پس آپ نے اپنے کپڑے کی ایک طرف اپنی ناک پر رکھی پھر کہا: اُف اُف" ابوبکر نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس شے کی بو اور گندگی محسوس کرنا جسے سونگھے۔ اور بعض نے کہا ہے: اف کا معنی ہے کسی کو حقیر اور قلیل جاننا، یہ

1۔ الترغیب والترہیب، ترہیب من دعا الانسان علی نفسہ وولدہ و خادمہ و مالہ، جلد 2، صفحہ 504، حدیث 2495

2۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 41، حدیث 43848

الافف سے لیا گیا ہے اور اس کا معنی قلیل ہونا ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: اس کا اصل معنی ہے تیرا کسی ایسی شے کو پھونک مارنا جو ریت اور مٹی وغیرہ سے تجھ پر گرتی ہے، اور اس جگہ کے لئے جس سے تو کوئی شے دور کرنے اور ہٹانے کا قصد کرے تا کہ تو وہاں بیٹھ سکے، پس ہر ثقیل (اور ناپسندیدہ) شے کے لئے یہ کلمہ کہا گیا ہے۔ اور ابو عمرو بن علاء نے کہا ہے: الأف سے مراد ناخنوں میں پائی جانے والی میل کچیل ہے اور التف سے مراد ناخنوں کے کٹے ہوئے ریزے ہیں۔ اور زجاج نے کہا ہے: اُف کا معنی بدبو ہے۔ اور اصمعی نے کہا ہے: الأف سے مراد کان کی میل ہے، اور التف سے مراد ناخنوں کی میل ہے، پس اس کا استعمال کثیر ہے یہاں تک کہ اسے ہر اس شے میں ذکر کیا گیا ہے جس کے ساتھ کسی کو اذیت دی جاتی ہے۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر اللہ تعالیٰ عقوق (نافرمانی) میں سے کوئی شے اُف سے بھی ادنیٰ اور گھٹیا پاتا تو یقیناً وہ اس کا ذکر کرتا پس نیکی اور احسان کرنے والا جو عمل کرنا چاہے کرے وہ ہرگز جہنم میں داخل نہ ہوگا) ۔ اور والدین کی نافرمانی کرنے والا جو چاہے عمل کرے وہ ہرگز جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“ ہمارے علماء نے کہا ہے: بے شک والدین کے لئے اس کا اُف کہنا سب سے گھٹیا اور ادنیٰ لفظ ہے کیونکہ اس نے ان دونوں کو کفران نعمت اور ناشکری کے طور پر چھوڑا ہے، اور تربیت کا انکار کیا ہے، اور اس وصیت کو رد کیا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمائی۔ اور اُف وہ کلمہ ہے جو ہر چھوڑی ہوئی شے کے لئے کہا گیا ہے؛ اور اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا: أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (الانبیاء: 67) (تف ہے تم پر نیز ان بتوں پر جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا) یعنی تم کو اور تمہارے ساتھ ان بتوں کو چھوڑنا ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَنْهَرْهُمَا، النهر کا معنی جھڑکنا اور غصے کا اظہار کرنا ہے۔ وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا یعنی تو ان سے بڑی لطافت اور نرمی کے ساتھ گفتگو کرے۔ مثلاً: یا أبتاه و یا أماه (اے ابا، اے اماں) بغیر اس کے کہ ان کا نام پکارے یا ان کی کوئی کنیت پکارے؛ یہ عطا نے کہا ہے۔ اور ابو البداح تجیبی نے کہا ہے: میں نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کو کہا قرآن کریم میں والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کے بارے جو کچھ ہے اسے میں جانتا ہوں سوائے اس قول باری تعالیٰ کے: وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا یہ قول کریم کیا ہے؟ تو حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: غلطی کرنے والے غلام کا اپنے آقا کو درشت اور سخت کلمات کہنا۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ یہ والدین کے ساتھ شفقت و رحمت کرنے سے استعارہ ہے اور ان کے لئے عجز و انکساری اور تذلل کا اظہار کرنا ہے جیسا کہ رعایا امیر کے لئے اور غلام اپنے آقاؤں کے لئے تذلل اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں، جیسا کہ اسی طرف حضرت سعید بن مسیب نے اشارہ کیا ہے، اور پروں کو جھکانے اور انہیں کھڑا کرنے کو بیان کیا جیسا کہ پرندے کے پر جس وقت وہ اپنے بچوں کے لئے اپنے پر کھڑے کر لیتا ہے۔ اور الذل سے مراد نرمی کرنا ہے۔ اور جمہور کی قرأت ذال کے ضمہ کے ساتھ ہے، یہ ذَلَّ یَذِلُّ ذُلًّا و ذِلَّةً و مذلة فهو ذال و ذلیل سے ماخوذ ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس اور حضرت عروہ بن زبیر نے الذِّل ذال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے،

اور یہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: دابۃ ذلول بینۃ الذّل۔ اور جانوروں میں ذل سے مراد یہ ہوتا ہے کہ جس کو مطیع بنانا آسان ہو مشکل نہ ہو، پس اس آیت کے حکم سے چاہئے کہ انسان اپنے آپ کو اپنے والدین کے ساتھ انتہائی اچھی عجز وانکساری میں رکھے، اپنے اقوال، حرکات وسکنات اور اپنے دیکھنے میں، اور وہ ان کی طرف اپنی تیز نگاہ سے نہ دیکھے کیونکہ وہ غصے والے کی نظر ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 15۔ اس آیت میں خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس سے مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین موجود نہ تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (الشعراء) میں الذّل کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہاں حق کی عظمت اور اس کی تاکید کے اعتبار سے اس کا ذکر کیا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: مِنَ الرَّحۡمَةِ میں مِنۡ بیان جنس کے لئے ہے، یعنی بے شک یہ جھکنا ایسی رحمت اور شفقت سے ہو جو نفس (دل) میں راحت وسکون پہنچانے والی ہو، نہ کہ وہ کام لینے کے اعتبار سے ہو۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ انتہا غایت کے لئے ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنے آباء پر رحم کرنے اور ان کے لئے دعا مانگنے کا حکم ارشاد فرمایا، اور یہ کہ تو ان کے ساتھ رحم کا سلوک کر جیسے انہوں نے تجھ پر رحم اور شفقت کی اور تو ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کر جیسے انہوں نے تیرے ساتھ نرمی کی، جب وہ تیرے والی اور محافظ تھے اس حال میں کہ تو صغیر تھا، جاہل اور محتاج تھا پس انہوں نے تجھے اپنی ذاتوں پر ترجیح دی، وہ اپنی راتیں جاگتے رہے، وہ خود بھوکے رہے اور تجھے خوب پیٹ بھر کر کھلایا، وہ خود ننگے رہے اور تجھے لباس پہنایا، پس تو انہیں جزا اور بدلہ نہ دے مگر (اس وقت) کہ جب وہ بڑھاپے کے سبب اس حد کو پہنچ جائیں جس میں تو عہد طفولیت میں تھا۔ اور تو ان کا والی ومددگار ہو جیسا کہ وہ تیرے والی اور مددگار تھے، اور اس وقت ان کے لئے ترجیح وتقدم کی فضیلت ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی بیٹا والد کو جزا اور بدلہ نہیں دے سکتا مگر یہ کہ وہ اسے کسی کی ملکیت میں پائے اور پھر اسے خرید لے اور اسے آزاد کر دے (1)''۔ اس حدیث کے بارے میں بحث سورۂ مریم میں آئے گی۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: كَمَا رَبَّيٰنِيۡ تربیت کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے تاکہ بندے کو والدین کی شفقت اور تربیت کے دوران ان کی مشکلات اور مشقت یاد آئے، پس یہ اس میں ان کے ساتھ شفقت اور نرمی ومہربانی کا سلوک کرنے میں اضافہ کا باعث ہوگا، اور یہ سب مومن والدین کے بارے میں ہے۔ اور قرآن کریم نے مشرک مرنے والوں کے لئے استغفار کرنے سے منع کیا ہے اگرچہ وہ انتہائی قریبی ہوں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے اس قول کے ساتھ منسوخ ہے: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ يَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اُولِيۡ قُرۡبٰى مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُمۡ اَصۡحٰبُ الۡجَحِيۡمِ (التوبہ)

پس جب مسلمان کے والدین ذمی ہوں تو وہ ان کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے یہاں حکم دیا ہے، مگر کفر پر ان کے مرنے کے بعد ان کے لئے رحم کی دعا نہ کرے، کیونکہ یہ اکیلا حکم مذکورہ آیت کے ساتھ منسوخ

1۔ صحیح مسلم، کتاب العتق، باب فضل العتق الوالد، جلد 1، صفحہ 495

ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نسخ کا محل نہیں ہے، پس یہ تو مشرک والدین کے لئے دنیوی رحمت کے بارے دعا ہے جب تک وہ زندہ رہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یا اس آیت کا عموم اسی کے ساتھ خاص ہے، نہ کہ آخرت کی رحمت کے ساتھ، بالخصوص جب یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کیا، تو ان کی ماں نے اپنے آپ کو ننگے بدن سخت گرمی (دھوپ) میں ڈال دیا، اس کا ذکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: مناسب ہے وہ مرجائے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت مسلمان والدین کے لئے دعا کرنے کے بارے خاص ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس کا عموم اسی طرح ہے جیسے ہم نے ذکر کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ آدمی جس نے شام اس حال میں کی کہ وہ اپنے والدین کو راضی کرنے والا ہو اور صبح کی شام کی اور صبح کی، تو اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے ہیں اگر چہ وہ ایک سے داخل ہوگا پھر ایک سے، اور جس نے شام اور صبح کی اس حال میں کہ وہ اپنے والدین کو ناراض کرنے والا ہو اور اس نے شام اور صبح اسی طرح کی تو اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے ہیں۔ اگر چہ وہ ایک میں داخل ہوگا اور پھر ایک میں۔'' تو ایک آدمی نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر چہ انہوں نے اس کے ساتھ ظلم اور زیادتی کی ہو؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر چہ انہوں نے اس کے ساتھ ظلم ہی کیا ہو، اگر چہ انہوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہو، اگر چہ انہوں نے اس کے ساتھ ظلم ہی کیا ہو۔'' اور ہم نے اسناد متصل کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: ایک آدمی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک میرے باپ نے میرا مال لے لیا ہے، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو کہا: ''تو اپنے باپ کو میرے پاس لے آ''۔ پس اتنے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: بے شک اللہ عزوجل آپ کو سلام فرمارہا ہے اور آپ کو فرمارہا ہے کہ جب وہ بوڑھا شیخ آپ کے پاس آئے تو اس سے اس شے کے بارے پوچھنا جو اس نے اپنے دل میں کہی اور اس کے کانوں نے اسے نہیں سنا۔'' پس جب وہ بوڑھا شیخ آیا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ''تیرے بیٹے کو کیا ہوا ہے وہ تیری شکایت کررہا ہے کیا تو اس کا مال لینا چاہتا ہے؟ تو اس نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پوچھئے کیا میں اسے اس کی پھوپھیوں یا اس کی خالاؤں میں سے کسی ایک یا اپنی ذات کے سوا کسی پر خرچ کرتا ہوں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خاموش رہ، تو ہمیں اس سے رہنے دے، تو مجھے اس شے کے بارے بتا جو تو نے اپنے دل میں کہی تیرے کانوں نے اسے نہیں سنا؟ تو اس بوڑھے شیخ نے کہا: قسم بخدا! یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہمارے یقین میں مسلسل اضافہ کرتا رہتا ہے، تحقیق میں نے اپنے دل میں کوئی چیز کہی جسے میرے کانوں نے نہیں سنا۔ آپ نے فرمایا: ''تم کہو اور میں سن رہا ہوں'' اس نے کہا میں نے کہا:

غَذَوتُكَ مولودا و مُنْتُكَ يافِعا — تُعَلّ بما أجْنِي عليك و تُنْهَلُ

إذا ليلةٌ ضافَتْكَ بالسُّقم لم أبِتْ — لسُقْمِكَ إلا ساهرا أتململُ

كأني أنا المطروق دونك بالذي — طُرِقتَ به دوني فعيني تهْمُلُ

تخاف الرّدی نفسی علیك و إنها لتعلم أن الموت وقتٌ مؤجّل

فلما بلغتَ السِّنّ والغایةَ التی إلیها مَدَی ما کنتُ فیك أؤمِّلُ

جعلتَ جزائی غِلظةً و فظاظةً کأنك أنت المُنعِم المُتفضِّلُ

فلیتك إذ لم ترعَ حقّ أبوّتی فعلتَ کما الجار المُصاقِب یفعلُ

فأولیتنی حقّ الجِوار ولم تکن علیّ بمال دون مالك تبخَلُ

راوی نے کہا: پس اس وقت حضور نبی مکرم ﷺ نے اس کے بیٹے کے گریبان کو پکڑا اور فرمایا: انت و مالك لأبیك(1) (تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے ہے)۔ طبرانی نے کہا ہے: لخمی یہ حدیث ابن منکدر سے اس طرح مکمل اور اشعار کے ساتھ سوائے اس سند کے روایت نہیں کرتے اور عبید اللہ بن خلصہ اس کے ساتھ منفرد ہیں۔ واللہ اعلم۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ ۚ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا ۝۲۵

''تمہارا رب بہتر جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اگر تم نیک کردار ہو گے تو بے شک اللہ تعالیٰ بکثرت تو بہ کرنے والوں کے لئے بہت بخشنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِكُمْ تمہارا رب بہتر جانتا ہے جو کچھ والدین کے ساتھ رحم و مہربانی کرنے اور ان پر شفقت کرنے کے اعتقاد میں سے تمہارے دلوں میں ہے یا اس کے علاوہ نافرمانی یا محض ریاکاری کے لئے ظاہراً ان سے نیکی اور احسان کرنے میں سے (جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے)، اور ابن جبیر نے کہا ہے: مراد وہ جلد بازی ہے جو تیزی میں ہو جاتی ہے(2)، جیسا کہ بغیر ارادہ کے تیزی سے کوئی کام ہو جانا اور پھسل جانا، یہ آدمی سے اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ہو سکتی ہے، اور اس سے کسی تکلیف کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ یعنی اگر تم والدین کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے کی نیت میں سچے ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسی جلد بازی کو معاف فرما دیتا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا یہ اصلاح اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی اطاعت کی طرف بار بار لوٹنے اور رجوع کرنے کی شرط کے ساتھ مغفرت اور بخشش کا وعدہ ہے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ وہ بندہ ہے جو توبہ کرتا ہے پھر گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا اور پھر گناہ کرتا ہے(3)۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''الاواب'' ''الحفیظ الذی اذا ذکر خطایا، استغفر منها'' (وہ توبہ کی حفاظت کرنے والا کہ جب وہ اپنے گناہوں کو یاد کرتا ہے تو ان سے استغفار کرتا ہے۔) اور عبید بن عمیر نے کہا ہے: اواب سے مراد وہ لوگ ہیں جو تنہائی اور خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کرتے ہیں پھر اللہ عزوجل سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور یہ اقوال باہم قریب ہیں۔ اور عون عقیلی نے کہا ہے: اوابون وہ ہیں جو چاشت کی نماز پڑھتے ہیں اور صحیح میں ہے: صلاۃ

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 466، حدیث 45471۔ ایضاً سنن ابن ماجہ، باب مال الرجل من مال ولده، حدیث 2281، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 80 3۔ تفسیر ماوردی، جلد 2، صفحہ 239

الاوابین حین ترمض الفصال (1) (اوابین کی نماز اس وقت ہوتی جب اونٹ کے بچوں کے قدم جلیں) اور لفظ کی حقیقت یہ ہے کہ یہ آب یؤوب سے ہے جب وہ رجوع کر لے، لوٹ آئے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝۲۶ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝۲۷

''اور دیا کرو رشتہ دار کو اس کا حق اور مسکین اور مسافر کو بھی اور فضول خرچی نہ کیا کرو۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکر گزار ہے۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ یعنی رشتہ دار کو اس کا حق اسی طرح دیا کرو جیسے تم والدین کے حق کی رعایت کرتے ہو اور صلہ رحمی کرو، پھر مسکین اور مسافر پر بھی صدقہ کرو۔ اور قول باری تعالیٰ: وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ کے بارے میں علی بن حسین نے کہا ہے: اس سے مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ان کے حقوق بیت المال سے دینے کا حکم فرمایا ہے (2)، یعنی غزوہ اور مال غنیمت میں سے ذوالقربیٰ کے حصہ سے (ان کا حق ادا کرو) اور یہ خطاب والیوں یا ان کے قائم مقام حاکموں کو ہو سکتا ہے۔ اور اس آیت میں صلہ رحمی، حاجت کو پورا کرنے، ضرورت کے وقت مال کے ساتھ غمخواری کرنے اور ہر اعتبار سے معاونت کرنے میں سے جو متعین ہیں وہ سب اس میں ملا دیئے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تُبَذِّرْ یعنی بغیر حق کے مال خرچ کرنے میں فضول خرچی نہ کر۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: تبذیر سے مراد مال کو غیر حق میں خرچ کرنا ہے، اور خیر اور نیکی کے عمل میں تبذیر (فضول خرچی) نہیں ہے۔ اور یہی جمہور کا قول ہے۔ اور اشہب نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے: التبذیر سے مراد مال کو اس کے حق سے لینا اور اسے غیر حق میں خرچ کرنا ہے، اور یہی اسراف (فضول خرچی) ہے، اور یہ حرام ہے (3)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ اور اللہ تعالیٰ کے قول اِخْوَانَ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کے حکم کے تابع ہیں، کیونکہ مبذِّر (فضول خرچی کرنے والا) فساد پھیلانے کی کوشش کرتا ہے جیسا کہ شیاطین۔ یا یہ کہ وہ ایسے کام کرتے ہیں جو ان کے نفس ان کے لئے مزین اور آراستہ کر دیتے ہیں، یا یہ معنی ہے کہ انہیں کل (قیامت کے دن) جہنم میں ان (شیاطین) کے ساتھ ملا دیا جائے گا؛ یہ تین اقوال ہیں۔

یہاں الاخوان اخ کی جمع ہے جو کہ نسبی بھائی نہ ہو، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (بے شک اہل ایمان بھائی بھائی ہیں) اور قول باری تعالیٰ: وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا یعنی تم شیطان کی متابعت اور فساد میں اس کی مشابہت اختیار کرنے سے بچو۔ اور الشیطان اسم جنس ہے۔ اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے اخوان الشیطان مفرد پڑھا ہے، اور اسی

1۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 807، حدیث 21506

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 450

3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1203

طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ثابت ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ جس نے اپنا مال حاجات وضروریات سے زائد شہوات میں خرچ کیا اور اس نے اسے ختم اور فنا کرنے کے لئے اس طرح پیش کیا تو وہ فضول خرچ ہے۔ اور جس نے اپنے مال کا نفع اپنی شہوات میں خرچ کیا اور اصل مال یا غلام محفوظ رکھا تو وہ فضول خرچ نہیں ہے۔ اور جس نے ایک درہم حرام میں خرچ کیا تو وہ فضول خرچ ہے اور اس پر وہ درہم حرام میں خرچ کرنے پر پابندی لگائی جائے گی، اور اگر اس نے اسے شہوات میں خرچ کیا تو اس پر پابندی نہیں لگائی جائے گی مگر جب اس کے بارے فنا کرنے اور ضائع کرنے کا خوف ہو(1) (تو پھر پابندی لگا دی جائے گی۔)

وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

"اور اگر (بوجہ تنگدستی) تجھے ان سے منہ پھیرنا پڑے اور تم اپنے رب کی رحمت (یعنی خوشحالی) کے متلاشی ہو جس کی تمہیں توقع ہے (اس اثنا میں) ان سے بات کرو جو بڑی نرمی سے کرو۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس قول کے ساتھ خاص کیا ہے: وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا اور یہ انتہائی عجیب اور خوبصورت تادیب ہے اور انتہائی عمدہ اور لطیف قول ہے، یعنی آپ ان سے غنی اور قدرت کے ہوتے ہوئے حقیر سمجھنے والوں کے اعراض کی طرح اعراض نہ کریں کہ آپ انہیں محروم کر دیں۔ بلاشبہ کسی عارض آنے والے عجز اور پیش آنے والی رکاوٹ (تنگدستی) کے وقت آپ کا ان سے اعراض کرنا (منہ پھیرنا) جائز ہے، اور آپ اس وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے خوشحالی کا دروازہ کھولنے کی توقع اور امید رکھیں تاکہ آپ اس کے سبب سائل کی دلجوئی اور غمخواری کر سکیں، پس اگر آپ پر ایسی حالت طاری ہو تو اس دوران ان سے بڑی نرمی کے ساتھ بات کرو۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس کے سبب نزول کے بارے میں ابن زید نے کہا ہے: یہ آیت ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگتے تھے اور آپ انہیں دینے سے انکار فرما دیتے تھے، کیونکہ آپ ان کے بارے یہ جانتے تھے کہ وہ مال فساد وغیرہ پھیلانے میں خرچ کرتے ہیں، پس ان سے اس رغبت کے تحت منہ پھیر لیتے تھے کہ ان کو فساد سے روکنے میں اجر ہے تاکہ آپ ان کے فساد میں ان کے معاون اور مددگار ثابت نہ ہوں(2)۔ اور عطا خراسانی نے قول باری تعالیٰ: وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا کے بارے میں کہا ہے: یہ والدین کے ذکر میں نہیں ہے، (بلکہ) مزینہ قبیلے سے کچھ لوگ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے وہ آپ سے سواریوں کا مطالبہ کرنے لگے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں کوئی شے نہیں پاتا جس پر میں تمہیں اٹھاؤں" (سوار کروں) پس وہ واپس پھرے اس حال میں کہ ان کی آنکھیں غم کے آنسو بہا رہی تھیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا اس میں رحمة سے مراد الفیء (مال فئی) ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1203 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 450

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا** اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے لئے دعا کرنے کا حکم ارشاد فرمایا، یعنی ان کے لئے اپنی دعا کے ساتھ ان کا فقر و افلاس ان پر آسان کر دو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے لئے ایسی دعا کرو جو ان کے لئے فتح اور اصلاح کو متضمن ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: **وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ** کا معنی ہے: یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ اپنے ہاتھ کے تنگ ہونے کی وجہ سے انہیں دینے سے منہ پھیریں تو اس اثنا میں ان سے بات کرو تو بڑی نرمی سے کرو، یعنی انتہائی حسین اور خوبصورت انداز میں بات کریں اور اپنا عذر بیان فرمادیں، اور ان کے لئے وسعت رزق کی دعا فرمادیں، اور یہ کہیں: جب میں نے وسعت پائی تو میں ضرور دوں گا اور عزت و تکریم بھی کروں گا، کیونکہ مواسات اور غمخواری کا عمل اپنے نفس کی خوشی اور خوشحالی کی حالت میں کیا جاسکتا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کسی چیز کے بارے سوال کیا جاتا اور آپ کے پاس دینے کے لئے وہ چیز نہ ہوتی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے رزق آنے کا خاموشی سے انتظار کرتے (کیونکہ آپ) سائل کو رد کرنا ناپسند کرتے تھے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کوئی چیز مانگی جاتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دینے کے لئے وہ چیز نہ ہوتی تو آپ فرماتے: ''اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اپنے فضل سے عطا فرمائے گا۔'' پس اس تاویل کی بنا پر رحمۃ سے مراد وہ رزق ہے جس کا انتظار کیا جائے۔ اور یہ حضرت ابن عباس، مجاہد اور عکرمہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ اور **عَنْهُمُ** کی ضمیر ان کی طرف لوٹ رہی ہے جن کا ذکر آباء، قرابتداروں، مساکین اور مسافروں میں سے پہلے گزر چکا ہے۔ اور **قَوْلًا مَّيْسُوْرًا** یعنی ایسی بات جو انتہائی نرم، لطیف اور اچھی ہو، یہ مفعول بمعنی فاعل ہے، اور لفظ یُسر سے ماخوذ ہے جیسا کہ میمون ہے، یعنی حسین و جمیل وعدہ، جیسا کہ ہم نے اسے بیان کر دیا ہے۔

اور کسی نے کیا خوب کہا ہے:

اِلّا تکن وَرِقی یوما أجود بھا	للسائلین فانّی لیّن العُودِ
لایعدم السائلون الخیر من خلقی	إمّانوالی وإمّا حسنُ مردودی

تو کہتا ہے: یَسَّرت لک کذا جب تو اسے تیار کر دے (تو تو کہے گا میں نے تیرے لئے اس طرح آسانی کر دی)۔

وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾

''اور نہ بنا لو اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن کے اردگرد اور نہ ہی اسے بالکل کشادہ کر دو ورنہ تم بیٹھ جاؤ گے ملامت کئے ہوئے درماندہ۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: **وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ** یہ مجاز ہے اور اس کے ساتھ اس بخیل کو تعبیر کیا گیا ہے جو اپنے دل سے اپنے مال میں سے کوئی شے نکالنے کی قدرت نہیں رکھتا، پس اس کی مثال اس طوق کے ساتھ بیان کی گئی جو تصرف بالید سے مانع ہوتا ہے۔ اور صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بخیل اور صدقہ کرنے والے کی مثال بیان فرمائی کہ وہ ایسے دو آدمیوں کی طرح ہیں جن پر لوہے کے دو جبے ہوں اس حال میں کہ ان کے ہاتھ ان کے سینے اور ان کی ہنسلی کی جانب جکڑے ہوئے ہوں پس صدقہ کرنے والا جب بھی کوئی صدقہ دیتا ہے تو وہ (جبہ) اس سے کھل جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے پوروں کو ڈھانپ لیتا ہے اور اسکے (چلنے کے) اثر (نشان) کو مٹا دیتا ہے، ختم کر دیتا ہے۔ اور بخیل کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ جب بھی صدقہ کا قصد اور ارادہ کرتا ہے تو وہ (جبہ) اور سکڑ جاتا ہے اور ہر حلقہ اپنی جگہ کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: پس میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی انگلیاں اس طرح اپنے گریبان میں ڈال کر یہ بیان کرتے ہوئے دیکھا ہے پس اگر تو آپ کو اسے وسیع (کھلا) کرتے ہوئے دیکھتا اور تو وسیع نہ کرتا(1) (تو تجھے تعجب ہوتا۔)

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ مال کو ختم کرنے کے لئے کھلے ہاتھ کے ساتھ مثال بیان فرمائی، پس اگر ہتھیلی کو بند کر لیا جائے تو جو کچھ اس میں ہوتا ہے وہ اسے روک لیتی ہے، اور اسے بالکل کھول دینا اسے ختم کر دیتا ہے جو اس میں ہوتا ہے۔ یہ سارے کا سارا خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، اور ایسا قرآن کریم میں کثرت سے آیا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کے سردار ہیں اور ان کے رب کے پاس ان کے لئے واسطہ ہیں تو پھر آپ کی ذات کے ساتھ ان کو تعبیر کیا گیا ہے اور یہ اس بارے میں عربوں کی عادت جاریہ کے مطابق ہے۔ اور یہ بھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کوئی چیز دوسرے دن کے لئے ذخیرہ نہ کرتے تھے، اور فاقہ کشی کرتے تھے حتیٰ کہ بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ اور بہت سے صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام اموال خرچ کر دیتے تھے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر کوئی سختی نہیں کرتے تھے اور نہ انہیں منع کرتے تھے اس لئے کہ ان کا یقین صحیح اور ان کی بصیرت مضبوط اور پختہ تھی۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے خرچ کرنے میں افراط سے منع فرمایا ہے، اور اس آدمی کو اپنا سارا مال نکالنے سے منع فرمایا ہے جس کے بارے اپنے ہاتھ سے نکالے گئے مال پر حسرت و درماندگی کا خوف ہو، اور رہا وہ جس کو اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر وثوق ہو اور جو اس نے خرچ کیا ہے اس پر ثواب جزیل کا یقین ہو تو وہ اس آیت کی مراد نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ خطاب صرف حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ خاص ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں آپ کو خرچ کرنے کی کیفیت کی تعلیم دی ہے اور آپ کو میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت جابر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: ایک بچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی: میری ماں اس اس طرح کا آپ سے سوال کر رہی ہے (یعنی فلاں فلاں چیز مانگ رہی ہے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آج تو ہمارے پاس کوئی شے نہیں ہے۔" اس نے کہا: پس وہ آپ کو کہتی ہے اپنی قمیص مجھے پہنا دو۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص مبارک اتاری اور وہ اسے دے دی اور خود گھر میں ننگے بیٹھ گئے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: پس حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کے لئے اذان کہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باہر تشریف لانے کا انتظار کرنے لگے، اور دل مشغول ہو گئے، تو ان میں سے بعض اندر آئے دیکھا تو آپ ننگے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، مثل المنفق والبخیل، جلد 1، صفحہ 328

بدن (یعنی قمیص کے بغیر) تھے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ سب خیر اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کے بارے ہے، اور رہا فساد کے لئے خرچ کرنا تو وہ قلیل ہو یا کثیر سب حرام ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت نے ان امور میں ساری دولت خرچ کرنے سے منع کیا ہے جن میں مومنین کی طرف سے پہلے مطالبہ ہوتا ہے، اس لئے کہ جو اس کے بعد آئے وہ اس شے سے محروم نہ رہے یا پھر منفق اپنے اہل وعیال کو محروم نہ کر دے۔ اور اسی طرح کسی حکیم اور دانا کا قول ہے: میں نے کبھی کوئی فضول خرچی نہیں دیکھی مگر یہ کہ وہ اپنے ساتھ کوئی حق ضائع کرنے والی ہوتی ہے۔ اور یہ آیت نقاہت حال سے متعلقہ آیات میں سے ہے پس اس کا حکم نہیں بیان کیا جاسکتا مگر لوگوں میں سے ایک ایک شخص کے اعتبار سے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فَتَقْعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا ابن عرفہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے آپ نہ فضول خرچی کریں اور نہ اپنا مال ضائع کریں کہ آپ درماندہ ہو کر اور نفقہ وتصرف سے بالکل کٹ کر باقی رہ جائیں، جیسے تھکا ماندہ اونٹ ہوتا ہے، اور یہ وہ ہے جس کی قوت ختم ہو جائے اور اس کے سبب اس کے لئے اٹھنا، چلنا ممکن نہ رہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ ہُوَ حَسِیۡرٌ ۝ (ملک) (لوٹ آئے گی تیری طرف (تیری) نگاہ ناکام درآنحالیکہ وہ تھکی ماندی ہوگی۔) یعنی آنکھ تھکی اور کٹی ہوگی۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یعنی ورنہ تم اپنے کئے پر نادم ہو کر بیٹھ جاؤ گے (1)، پس انہوں نے اسے حسرت سے بنایا ہے، اور اس میں بہت بعد اور دوری ہے، کیونکہ الحسرۃ سے فاعل حسر اور حسران آتا ہے اور محسور نہیں آتا۔ اور الملوم سے مراد وہ ہے جس پر مال ضائع کرنے کی وجہ سے ملامت کی جاتی ہو، یا اسے وہ ملامت کرتا ہے جسے وہ دیتا نہیں۔

اِنَّ رَبَّکَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَقۡدِرُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیۡرًۢا بَصِیۡرًا ۝۳۰ وَ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ خَشۡیَۃَ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُہُمۡ وَ اِیَّاکُمۡ ؕ اِنَّ قَتۡلَہُمۡ کَانَ خِطۡاً کَبِیۡرًا ۝۳۱

''بے شک آپ کا رب کشادہ کرتا ہے روزی جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے (جس کے لئے چاہتا ہے) یقیناً وہ اپنے بندوں (کے حالات) سے خوب آگاہ ہے اور (انہیں) دیکھنے والا ہے۔ اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے، ہم ہی رزق دیتے ہیں انہیں بھی اور تمہیں بھی، بلاشبہ اولاد کو قتل کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اس آیت کے بارے میں سورۃ الانعام میں بحث گزر چکی ہے، والحمد للہ۔ اور الاملاق سے مراد فقر وافلاس اور ملکیت کا نہ ہونا ہے۔ أملق الرجل یعنی اس کے لئے سوائے مَلَقات کے کچھ باقی نہیں رہا اور ملقات سے

1۔ تفسیر طبری، جلد 15-16، صفحہ 91

مراد بڑے بڑے ہموار اور چکنے پتھر ہیں۔

ہذلی نے شکاری کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

أُتِيحَ لها أُقَيْدِرُ ذو حَشِيف   إذا سامَتْ على المَلَقات ساما

ملقات کا واحد مَلَقَة ہے۔ اور أُقیدر، اقدر کی تصغیر ہے، مراد چھوٹے قد کا آدمی ہے۔ اور الحشیف من الثیاب سے مراد پرانا کپڑا ہے۔ اور سامت کا معنی مرّت (وہ گزری) ہے۔ اور شمر نے کہا ہے: املق لازم اور متعدی دونوں طرح ہے، أَمْلَقَ جب کوئی محتاج ہو جائے، اور أملق الدّھر ما بیدہ (زمانے نے اس کے ہاتھ میں جو تھا اسے ختم کر دیا۔) اوس نے کہا ہے:

وأَملق ما عندی خطوب تَنَبَّلُ

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: خِطْأً خا کے کسرہ، طا کے سکون اور ہمزہ اور قصر کے ساتھ جمہور کی قرأت ہے۔ اور ابن عامر نے خَطَأً خا اور طا کے فتحہ اور ہمزہ مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہی ابو جعفر یزید کی قرأت ہے۔ اور یہ دونوں قرأتیں خَطِئَ سے ماخوذ ہیں جب کوئی آدمی جان بوجھ کر گناہ کرے۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: کہا جاتا ہے خَطِئَ فی ذنبہ خَطَأً جب وہ اس میں گنہگار ہو، اور أخطأ جب کوئی خطا کے راستے پر چلے چاہے بالارادہ چلے یا بغیر ارادہ کے۔ فرمایا: اور خَطِئَ أخطأ کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور ازہری نے کہا ہے: کہا جاتا ہے خَطِئَ یخطأ خِطْئًا جب کوئی خطا اور غلطی کا قصد کرے) جیسا کہ أَثِمَ یأثم إثمًا ہے۔ اور أخطأ جب وہ ارادہ اور قصد نہ کرے، إخطاء و خطأ۔

شاعر نے کہا ہے:

دَعِينى إنما خَطَئِى وَصَوبِى   علىّ وإنّ ما أهلكتُ مالُ

اس میں خَطَئِی بالقصد غلطی کرنے کے معنی میں ہے۔

اور الخطأ اسم الاخطاء کے قائم مقام ہوتا ہے، اور یہ صواب کی ضد ہے اور اس میں دو لغتیں ہیں، ایک قصر اور یہی جید اور عمدہ ہے، اور دوسری مد کے ساتھ اور یہ قلیل ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے خَطَأً خا کے فتحہ، طا کے سکون اور ہمزہ کے ساتھ مروی ہے۔ اور ابن کثیر نے اسے خا کے کسرہ، طا کے فتحہ اور ہمزہ کی مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: میں اس قرأت کی کوئی وجہ اور دلیل نہیں پاتا، اسی وجہ سے ابو حاتم نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: یہ خاطأ یخاطئ سے مصدر ہے، اگرچہ ہم خاطأ نہیں پاتے لیکن ہم نے تخاطأ پالیا ہے، اور یہ خاطأ کا مطاوع ہے، پس اس پر انہوں نے ہماری راہنمائی کی ہے۔

اور اسی سے شاعر کا قول ہے:

تَخَاطَأَت النَّبلُ احشاءَہ   و أَخَّرَ یومی فلم أَعْجَلِ(1)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 452

اور مہاۃ (حسن) کے وصف میں کسی دوسرے نے کہا ہے:

تخاطأہ القنّاص حتی وجدتُه وخرطومُہ فی مَنْقَعِ الماء راسِبُ(1)

اور جوہری نے تخاطأہ بمعنی أخطأہ کیا ہے۔

اور اوفی بن مطر مازنی نے کہا ہے:

ألا أبلغا خُلّتی جابرا بأنّ خلیلك لم یُقْتَلِ

تخاطأت النَّبْلُ أحشاءہ وأخّر یومی فلم یَعْجَلِ

اور حسن نے خطاء خا اور طا کے فتحہ اور ہمزہ کو مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: یہ لغت میں معروف نہیں ہے پس یہ غلط ہے، جائز نہیں ہے۔ اور ابو الفتح نے کہا ہے: الخطأ أخطات سے ہے جیسا کہ عطاء اعطیت سے ہے، اور یہ اسم بمعنی مصدر ہے، اور حسن سے بھی خَطئی خا کے فتحہ کے ساتھ اور طا کی تنوین کے ساتھ بغیر ہمزہ کے مروی ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ۝۳۲

''اور بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ، بے شک یہ بڑی بے حیائی ہے، اور بہت ہی برا راستہ ہے۔''

اس میں ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى یہ وَلَا تزنوا کہنے سے زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے تم بدکاری کے قریب نہ جاؤ۔ اور الزنی کے لفظ میں مد اور قصر دونوں لغتیں ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

کانت فریضة ما تقول کما کان الزِّناء فریضةَ الرَّجْم

اور سَبِيْلًا تمیز کی بنا پر منصوب ہے: تقدیر کلام ہے: وساء سبیله سبیلاً (اور اس کا راستہ بہت ہی برا راستہ ہے) یعنی کیونکہ یہ جہنم تک پہنچا دیتا ہے۔ اور زنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اور اس میں اور اس کی قبح میں کوئی اختلاف نہیں ہے بالخصوص جب یہ پڑوسی کی بیوی کیساتھ ہو، اس سے غیر کے بچے کو خادم اور نائب بنانا ہوتا ہے اور اسے ہی بیٹا بنانا ہوتا ہے اور علاوہ ازیں اسے میراث سے حصہ دیا جاتا ہے اور پانیوں کے اختلاط کے سبب نسبوں میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور صحیح میں روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم باب فسطاط پر ایک حاملہ عورت کے پاس سے گزرے تو آپ نے فرمایا: ''شاید وہ چاہتا ہے کہ وہ اس سے وطی کرے''۔ تو لوگوں نے عرض کی: جی ہاں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تحقیق میں نے قصد کیا ہے کہ میں اس پر ایسی لعنت بھیجوں جو اس کی قبر میں اس کے ساتھ داخل ہو وہ کیسے اسے وارث بنائے گا حالانکہ وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو گا وہ کیسے اس سے خدمت لے گا حالانکہ وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو گا (2)؟''۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝۳۳

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 452 2۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، تحریم وطی الحامل، جلد 1، صفحہ 465

''اور نہ قتل کرو اس نفس کو جس کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے مگر حق کے ساتھ، اور جو قتل کیا جائے ناحق تو ہم نے مقتول کے وارث کو (قصاص کے مطالبہ کا) حق دے دیا ہے پس اسے چاہئے کہ قتل میں اسراف نہ کرے، ضرور اس کی مدد کی جائے گی۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ سورۃ الانعام میں اس کے بارے کلام گزر چکی ہے۔ وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا اور جو آدمی بغیر ایسے سبب کے قتل کیا گیا جو قتل کو واجب اور ثابت کرتا ہو۔ فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ تو ہم نے اس کے ولی یعنی اس کے خون کے مستحق کو (قصاص کے مطالبہ کا حق دے دیا ہے)۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ولی کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرد ہو، کیونکہ لفظ مذکر کے ساتھ اسے ولایت کے ساتھ مفرد ذکر کیا ہے۔ اور اسماعیل بن اسحاق نے قول باری تعالیٰ: فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ میں ذکر کیا ہے کہ یہ ارشاد مطلق لفظ ولی سے عورت کے نکلنے پر دلالت کرتا ہے۔ اور بالخصوص عورتوں کے لئے قصاص میں اس کا کوئی حق نہیں ہے اور اس (عورت) کے معاف کرنے کے بارے میں بھی کوئی روایت نہیں ہے، اور نہ اس کے لئے پورا حق لینا ہے۔ اور مخالف نے کہا ہے: بے شک یہاں ولی سے مراد وارث ہے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (التوبہ:71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں)۔

اور مزید فرمایا: وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ (الانفال:72) (اور جو لوگ ایمان تو لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی نہیں تمہارے لئے ان کی وراثت سے کوئی چیز) اور مزید فرمایا: وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ (الانفال:75) (اور قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، کتاب اللہ کی رو سے)۔ پس یہ تمام وارثوں کے لئے قصاص کے اثبات کا تقاضا کرتا ہے، اور رہا وہ جو انہوں نے ذکر کیا ہے کہ لفظ ولی اپنے ظاہر کے اعتبار سے مذکر ہے اور وہ واحد ہے، مفرد ہے، تو گویا وہ اس کی طرح ہے جو جنس کے معنی میں ہوتا ہے اور جنس میں مذکر و مونث سبھی برابر ہوتے ہیں، اور اس کی مکمل بحث مختلف کتب میں ہے (جو دونوں نظریات سے متعلق ہیں۔)

سُلْطَانًا یعنی ہم نے اسے اس پر ایسے مسلط کر دیا ہے کہ اگر چاہے تو وہ اسے (قاتل کو) قتل کر دے اور اگر چاہے تو اسے معاف کر دے، اور اگر چاہے تو اس سے دیت لے لے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک، اشہب اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے(1)۔ اور ابن وہب نے بیان کیا ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: سلطان سے مراد اللہ تعالیٰ کا امر (حکم) ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سلطان سے مراد حجت اور دلیل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: سلطان سے مراد اس کا مطالبہ کرنا ہے یہاں تک کہ وہ اسے دے دیا جائے۔ علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ اقوال باہم قریب قریب ہیں، اور ان میں

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1208

زیادہ واضح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا امر ہے پھر بلاشبہ اللہ عزوجل کا امر بطور نص واقع نہیں ہوا لہٰذا اس میں علماء نے اختلاف کیا ہے، پس ابن القاسم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: (کہ اسے) صرف قتل کا حق حاصل ہے۔ اور اشہب نے کہا ہے: اسے اختیار ہے، جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے، اور اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اس میں تین اقوال ہیں: مقتول کے قاتل کے سوا کسی کو قتل نہیں کیا جائے گا؛ یہ حضرات حسن، ضحاک، مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے...... اس کے ولی کے بدلے دو قتل نہیں کئے جائیں گے جیسا کہ عرب اس طرح کرتے تھے۔ تیسرا قول یہ ہے...... قاتل کا مثلہ نہیں کیا جائے گا؛ یہ طلق بن حبیب نے کہا ہے۔ اور یہ سب ہی مراد ہیں کیونکہ ان میں وہ اسراف ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ اور اس بارے مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ اور جمہور نے يُسْرِفْ یا کے ساتھ پڑھا ہے(2)، مراد ولی ہے (یعنی وہ اسراف نہ کرے)، اور ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے تسرف تا کے ساتھ قرأت کی ہے، اور یہی حضرت حذیفہ کی قرأت ہے۔ اور علاء بن عبدالکریم نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: یہ (حکم) پہلے قاتل کے لئے ہے۔ اور ہمارے نزدیک اس کا معنی یہ ہے فلا تسرف ایھا القاتل۔ (اے قاتل! تو اسراف نہ کر) اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آنے والے ائمہ کو خطاب کے معنی میں ہے، یعنی تم غیر قاتل کو قتل نہ کرو(3)۔ اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے: فلا تسرفوا فی القتل (پس تم قتل میں اسراف نہ کرو)۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا یعنی بلاشبہ اس کی مدد اور معاونت کی جائے گی، یعنی ولی کی مدد کی جائے گی۔ اور اگر کہا جائے: کتنے ولی ہیں جن کی مدد چھوڑ دی گئی اور وہ اپنے حق تک نہ پہنچ سکے؟ تو ہم کہیں گے: معونت کبھی حجت اور دلیل کے ظاہر ہونے کیساتھ ہوتی ہے اور کبھی اسے مکمل طور پر پانے کے ساتھ ہوتی ہے اور کبھی ان کے مجموعے کے ساتھ ہوتی ہے، پس ان میں سے جو بھی ہو وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے مدد و نصرت ہی ہے۔ اور ابن کثیر نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: بے شک مقتول مدد کیا گیا ہے(4)۔ نحاس نے کہا ہے: اس قول کا معنی یہ ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کے ولی کے ساتھ اس کی مدد کی ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ابی کی قرأت میں ہے فلا تسرفوا فی القتل ان ولی المقتول کان منصورا (پس تم قتل میں اسراف نہ کرو بے شک مقتول کے ولی کی مدد کی جائے گی)۔ نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: زیادہ بین یا ہے اور وہ ولی کے لئے ہوگی، کیونکہ بلاشبہ یہ کہا جارہا ہے: وہ اسراف نہ کرے اگر اس کو قتل کرنے کا اختیار حاصل ہو، اور یہ ولی کے لئے ہی ہے۔ اور تا کے ساتھ ہو تب بھی ولی کے لئے جائز ہوسکتا ہے، مگر اس میں وہ مخاطب کی تحویل کا محتاج ہوگا۔ ضحاک نے کہا ہے: یہ پہلی آیت ہے جو قتل کے بارے میں قرآن کریم میں نازل ہوئی، اور یہ مکی ہے(5)۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1209
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 95
4۔ ایضاً، جلد 16-15، صفحہ 97
5۔ ایضاً، جلد 16-15، صفحہ 96

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۳۴

''اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر ایسے طریقہ سے جو (اس یتیم کے لئے) بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور پورا کیا کرو اپنے عہد کو بیشک ان وعدوں کے بارے میں (تم سے) پوچھا جائے گا۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ اس کے بارے میں کلام سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اس کے بارے کئی مقامات پر کلام گزر چکی ہے۔ زجاج نے کہا ہے: ہر وہ کام جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور جس سے منع کیا ہے پس وہی عہد ہے (1)۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا عنہ، بے شک اس عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ پس کلام میں عنہ محذوف ہے، جیسا کہ یہ قول ہے: وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۞ (التحریم) بہ (اور وہی کرتے ہیں جس کے بارے وہ حکم دیئے جاتے ہیں)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک عہد کے بارے عہد توڑنے والے کو رلانے اور رسوا کرنے کے لئے سوال کیا جائے گا: تو نے کیوں توڑا ہے؟ جیسا کہ زندہ درگور کی گئی بچی سے درگور کرنے والے کو رلانے اور رسوا کرنے کے لئے سوال کیا جائے گا۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۳۵

''اور پورا پورا ماپو جب تم کسی چیز کو ماپنے لگو اور تولو تو اسے ترازو سے تولو جو بالکل درست ہو، یہی طریقہ بہتر ہے اور اس کا انجام بھی بہت اچھا ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ اس کے بارے کلام سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔

اور یہ آیت یہ تقاضا کرتی ہے کہ کیل (ماپ) کرنا بائع کے ذمہ ہے، یہ سورۂ یوسف میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اِلْقِسْطَاس (قاف کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ) سے مراد میزان (ترازو) ہے اور یہ لغت روم کا لفظ ہے؛ یہ ابن عزیز نے کہا ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: القسطاس، ترازو چھوٹا ہو یا بڑا۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: القسطاس سے مراد عدل کرنا ہے، اور آپ فرماتے تھے: یہ لغت رومیہ سے ہے، گویا کہ لوگوں کو کہا گیا ہے: اپنے وزنوں میں عدل کرتے ہوئے وزن کرو (2)۔ اور ابن کثیر، ابوعمرو، نافع، ابن عامر اور عاصم نے ابوبکر کی روایت میں اِلْقِسْطَاس قاف کے کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں (3)۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 242 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 445 3۔ ایضاً

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا یعنی پورا پورا ماپ کرنا اور صحیح صحیح وزن کرنا تیرے رب کے نزدیک بہتر اور زیادہ باعث برکت ہے۔ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا اور اس کا انجام بھی بہت اچھا ہے۔ حسن نے کہا ہے: ہمارے لئے ذکر کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی حرام پر قادر نہیں ہوتا پھر وہ اسے چھوڑ دیتا ہے صرف اللہ تعالیٰ کے خوف اور ڈر سے تو اللہ تعالیٰ اسے آخرت سے پہلے دنیا میں جلدی ملنے والی نعمت کیساتھ بدل دیتا ہے جو اس کے لئے اس (حرام) سے بہتر ہوتی ہے (1)۔

وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۞

''اور نہ پیروی کرو اس چیز کی جس کا تمہیں علم نہیں، بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کے متعلق (تم سے) پوچھا جائے گا۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَقْفُ یعنی پیروی نہ کرو اس کی جسے تم جانتے نہیں اور نہ وہ تیرا مقصود اور مراد ہو سکتی ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تو نہ کہہ میں نے دیکھا ہے حالانکہ تو نے نہیں دیکھا، اور میں نے سنا ہے حالانکہ تو نے نہیں سنا (2)، اور میں جانتا ہوں حالانکہ تو نہیں جانتا؛ اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تو اس چیز کے سبب کسی کی مذمت نہ کر جس کے بارے تیرے پاس علم نہیں ہے؛ اور یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ جھوٹے آدمی کا شہادت دینا ہے (3)۔ اور قتبی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے ظن اور وہم کی پیروی نہ کر۔ اور یہ تمام معانی باہم متقارب ہیں۔ اور القفو کا اصل معنی بہتان لگانا اور کسی باطل کی تہمت لگانا ہے اور اسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ہم بنو نضر بن کنانہ اپنی ماں کی پیروی نہیں کرتے اور نہ ہم اپنے باپ سے نفی کرتے ہیں (4)''۔ یعنی ہم اپنی ماں کو برا نہیں کہیں گے۔

اور کمیت نے کہا ہے:

فلا أرمي البرئ بغير ذنب ولا أقفو الحواصن إن قُفينا (5)

کہا جاتا ہے: قَفَوْتُه اقفوه اور قُفْتُه اقوفه اور قَفَيته جب تو کسی کے نشان کی پیروی کرے۔ اور اسی سے القافة ہے کیونکہ وہ ان کے آثار و نشانات قدم کی پیروی کرتا ہے اور ہر شی کے قافیہ سے مراد اس کا آخر ہوتا ہے، اور اسی سے قافية الشعر بھی ہے، کیونکہ وہ شعر کا آخر ہوتا ہے۔ اور اسی سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی المُقَفِّی ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام

1۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 787، حدیث 43113
2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1211
3۔ ایضاً
4۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 455
5۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 456۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، باب من نفی رجلا من قبیلته، حدیث نمبر 2601، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انبیاء علیہم السلام کے آخر میں تشریف لائے۔ اور اسی سے القائف ہے، یہ وہ ہے جو کسی شبہ کے اثر اور نشان کا پیچھا کرتا ہے (کھرا تلاش کرنے والا)۔ کہا جاتا ہے: قَافَ القائف یَقُوفُ جب وہ ایسا کرے (یعنی کھرا تلاش کر لے) اور آپ کہتے ہیں: قَفَوْتُ الأثر (میں نے نشان کا پیچھا کیا) اس میں فا قاف پر مقدم ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: شبہ یہ ہے کہ یہ لفظ ان بعض الفاظ میں سے ہو جن میں عرب کھیل اور تفریح کا عمل کرتے رہتے ہیں، جیسے وہ کہتے ہیں: رَعَمْلِی فی لَعَمْرِی میں ایسا کرتے ہیں۔ اور علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک فرقہ کی جانب سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا ہے: قفا و قاف، جیسا کہ عتا و عات ہے۔ اور منذر بن سعید اس طرف گئے ہیں کہ قفا اور قاف جبذ اور جذب کی مثل ہے۔

المختصر یہ کہ یہ آیت جھوٹے قول اور تہمت لگانے سے اور ہر اس سے جو جھوٹے اور ردی اقوال میں سے اس کے مشابہ ہو یہ اس سے منع کرتی ہے اور روکتی ہے۔ کسائی نے بیان کیا ہے کہ بعض لوگوں نے تَقُفْ قاف کو ضمہ اور فا کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جراح (قاضی بصرۃ) نے والفَآد فا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ بعض لوگوں کی لغت ہے، اور ابو حاتم وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: یہ آیت قافہ (آثار دیکھ کر پہچان کرنے والا) کے حکم کو متضمن ہے، کیونکہ جب یہ فرمایا: تم اس کی پیروی نہ کرو جس کے بارے تمہیں علم نہ ہو۔ تو یہ اس کے جواز پر دلیل ہے جس کے بارے ہمیں علم ہو، تو ہر وہ چیز جسے انسان جان لے یا اس کے بارے اسے ظن حاصل ہو جائے تو اس کے ساتھ اس کا حکم لگانا جائز ہے، اور اسی سے ہم نے قرعہ اندازی اور تخمینہ لگانے کے اثبات پر استدلال کیا ہے، کیونکہ یہ بھی غلبہ ظن کی ایک قسم ہے، اور اسے وسعت علم کا نام دیا جاتا ہے۔ پس (اعضاء و آثار دیکھ کر پہچان کرنے والا) بیٹے کو باپ کے ساتھ ان دونوں کے درمیان مشابہت پائے جانے کی وجہ سے ملا دیتا ہے، جیسا کہ ایک فقیہ فرع کو اصل کے ساتھ بطریق مشابہت ملا دیتا ہے۔ اور صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی مسرت و فرحت کی کیفیت میں میرے پاس تشریف لائے آپ کے چہرے کے خدوخال چمک رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کیا تو نہیں جانتی (1) کہ ایک اعضاء بدن دیکھ کر پہچان کرنے والے نے حضرت زید بن حارثہ اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی طرف دیکھا ہے اس حال میں کہ ان دونوں پر ایک چادر تھی وہ اپنے سروں کو ڈھانپے ہوئے تھے اور ان کے پاؤں ظاہر تھے تو اس (دیکھنے والے) نے کہا ہے: بے شک ان قدموں کا بعض اس کا بعض ہے۔“ (یعنی یہ دونوں ایک دوسرے کا جز ہیں۔) اور حدیث میں مُجَزِّز سے مراد قائف ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام ابو عبد اللہ مازری نے کہا ہے: زمانہ جاہلیت میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے نسب میں جرح قدح ہوتی تھی کیونکہ ان کا رنگ انتہائی زیادہ سیاہ تھا، اور ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ روئی سے زیادہ سفید تھے، اسی طرح اسے ابو داؤد نے احمد بن صالح سے ذکر کیا ہے۔ اور قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اور احمد کے سوا کسی نے کہا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا رنگ انتہائی صاف اور روشن تھا اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ انتہائی شدید سیاہ رنگ کے تھے اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، العمل بالحاق والقائف الولد، جلد 1، صفحہ 471

عربی کلب قبیلہ سے تھے، اور پھر آپ کو تیداوردوری آ پہنچی، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ الاحزاب میں آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 4۔ جمہور علماء نے بیٹے میں تنازع اور اختلاف کے وقت قیافہ شناس کی طرف رجوع کرنے پر اس سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قیافہ شناس کے قول سے بہت خوش ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہ نہیں تھے کہ آپ کو باطل اور غلط طریقہ سے خوش کیا جاسکے اور نہ آپ اس پر تعجب اور خوشی کا اظہار فرماتے۔ اور امام ابوحنیفہ، اسحاق، ثوری اور ان کے اصحاب رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے اس طرح نہیں لیا ہے اور استدلال اس سے کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث لعان میں مشابہت کو لغو قرار دیا ہے، جیسا کہ سورۃ النور میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 5۔ قیافہ شناس کے اقوال کو لینے والوں نے اختلاف کیا ہے کہ کیا ان اقوال کو آزاد عورتوں اور لونڈیوں دونوں کی اولاد میں قبول کیا جائے گا یا یہ لونڈیوں کی اولاد کے ساتھ مختص ہے؟ تو اس کے بارے دو قول ہیں: پہلا قول حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اس روایت میں جو آپ سے ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔ اور آپ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ یہ صرف لونڈی کی اولاد میں محصور ہے۔ اور صحیح وہ ہے جو آپ سے ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے اور وہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے، کیونکہ وہ حدیث جو اس باب میں اصل ہے بلاشبہ وہ آزاد عورتوں کے بارے میں واقع ہے، کیونکہ حضرت اسامہ اور ان کے والد رضی اللہ عنہما دونوں آزاد تھے تو اس سبب کو کیسے لغو قرار دیا جاسکتا ہے جس پر حکم کی دلیل کا انحصار ہے اور وہ اس کا باعث بنا ہے؟ یہ علماء اصول کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اور اسی طرح اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے کیا قیافہ شناسوں میں سے ایک کے قول پر اکتفا کیا جائے گا یا دو کا ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ شہادت ہے؟ پہلا قول ابن قاسم نے کہا ہے اور یہی خبر کا ظاہر ہے بلکہ اس کی نص ہے۔ اور دوسرا قول امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا یعنی ان میں سے ہر ایک سے اس کے بارے پوچھا جائے گا جو اس نے عمل کیا، پس دل سے اس کے بارے پوچھا جائے گا جس میں اس نے غور وفکر کیا اور اس کا اعتقاد بنایا۔ اور کان اور آنکھ سے اس کے بارے پوچھا جائے گا جو اس نے دیکھا اور جو سنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسان سے اس کے بارے پوچھے گا جسے اس کے کان، آنکھ اور اس کے دل نے جمع کیا ہوگا اور اس کی نظیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے: ”تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور ہر ایک سے اس کی اپنی رعیت کے بارے پوچھا جائے گا(1)“۔ پس انسان اپنے اعضاء پر حاکم ہے، تو گویا فرمایا یہ کہ ان تمام کے بارے انسان سے پوچھا جائے گا، تو اس صورت میں مضاف حذف ہوگا لیکن حجت میں پہلا معنی زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ اس کی تکذیب اس کے جوارح سے واقع ہوگی، اور یہ ذلت ورسوائی کی انتہا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾ (یٰسین) (آج ہم مہر لگا دیں گے کفار کے مونہوں پر اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں ان (بدکاریوں پر) جو وہ کمایا کرتے تھے) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: شَهِدَ عَلَيْهِمْ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، الجمعۃ فی القری والمدن، جلد 1، صفحہ 122

سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (حم السجدہ) ((اس وقت) گواہی دیں گے ان کے خلاف ان کے کان اوران کی آنکھیں اوران کی کھالیں اس بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے)۔اورانہیں سمع، بصراور فواد سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ ان کاادراک کرنے والے حواس ہیں، اوراس آیت میں انہیں مسئولہ بنایا ہے، اور یہ اس کی حالت ہے جو عقل اور سمجھ رکھتا ہے، پس اسی وجہ سے ان کوان کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ اور سیبویہ نے قول باری تعالیٰ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝ (یوسف) میں کہا ہے: بلاشبہ انہوں نے کہا: رَاَيْتُهُمْ میں نے ستاروں میں دیکھا، کیونکہ جب انہیں سجود کے ساتھ متصف کیا اور یہ (سجدہ کرنا) اس کا فعل ہے جو عقل رکھتا ہے تو پھر انہیں کنایۃً ان سے تعبیر کیا جو عقل رکھتے ہیں؛ اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اورزجاج نے بیان کیا ہے کہ عرب ذوالعقول اور غیر ذوالعقول کوان کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔

انہوں نے اورطبری نے یہ شعر بیان کیا ہے:

ذُمّ المنازل بعد منزلة اللِّوَى والعيش بعد أولئك الأيام (1)

یہ امر ہے ان کے نزدیک اس پر وقف کیا جاتا ہے، اور رہا شعر تو اس میں ایک روایت الاقوام کی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝

"اور نہ چلو زمین میں اکڑتے ہوئے (اس طرح) نہ تم چیر سکتے ہو زمین کو اور نہ پہنچ سکتے ہو پہاڑوں کے برابر بلندی میں۔ یہ سب (جن کا ذکر گزرا) ان میں سے ہر بری بات اللہ تعالیٰ کو (سخت) ناپسند ہے۔"

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا یہ غرور اور تکبر سے نہی ہے اور تواضع اور انکساری کا حکم ہے۔ المرح کا معنی ہے، بہت زیادہ خوشی اور فرحت کا اظہار کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی چلنے میں تکبر کا اظہار کرنا (یعنی اکڑ کر چلنا) ہے۔ بعض نے کہا ہے: انسان کا اپنی قدر اور مقام سے تجاوز کر جانا ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس سے مراد چال میں غرور اور خود پسندی کا اظہار کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی کسی نعمت پر اترانا اور اس کا شکر ادا نہ کرنا ہے (2) اور اکڑنا ہے۔ بعض نے کہا ہے: اس سے مراد نشاط اور چستی کا اظہار کرنا ہے۔ یہ تمام اقوال معنوی اعتبار سے قریب قریب ہیں لیکن یہ دو قسموں میں منقسم ہیں: ان میں سے ایک قسم مذموم (قابل مذمت) ہے اور دوسری محمود (قابل تعریف) ہے، پس تکبر کرنا، اترانا، غرور کرنا، اور انسان کا اپنی قدر سے تجاوز کرنا یہ سب مذموم ہے اور فرحت وانبساط اور نشاط وچستی کا اظہار کرنا محمود اور اچھا ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان دو میں سے ایک کے ساتھ (یعنی فرحت اور نشاط) اپنے آپ کو متصف فرمایا ہے، پس صحیح حدیث میں ہے اللهُ أفرح بتوبة العبد من رجل ... الحدیث (3) (اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ سے اس آدمی کی نسبت زیادہ خوش ہوتا

1۔ تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 102
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 244
3۔ مجمع الزوائد، کتاب التوبة، باب الحث على التوبة، جلد 10، صفحہ 322، حدیث 17498

ہے)۔ اور سستی شرعاً مذموم ہے اور نشاط اس کی ضد ہے۔ اور کبھی تکبر اور جو چیزیں اس کے معنی میں ہیں محمود اور اچھی ہوتی ہیں، اور وہ یہ کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور ظالموں کے خلاف ہوں۔ ابو حاتم محمد بن حبان نے ابن جابر بن عتیک سے اور انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''غیرت میں سے وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ مبغوض اور ناپسند جانتا ہے اور وہ بھی ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور غرور اور تکبر میں سے ایک وہ ہے جسے اللہ عزوجل پسند فرماتا ہے اور اس میں سے ایک وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ مبغوض قرار دیتا ہے، پس وہ غیرت جسے اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ وہ غیرت ہے جو دین کے بارے میں ہو اور وہ غیرت جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے وہ وہ غیرت ہے جو دین کے معاملہ میں نہ ہو اور وہ رعونت و تکبر جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے وہ آدمی کا جنگ کے وقت اور صدقہ دیتے وقت اپنے نفس کے ساتھ اظہار فخر کرنا ہے اور وہ تکبر و غرور جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے وہ باطل اور غلط کاموں میں اس کا غرور اور تکبر کرنا ہے'' (1)۔ اسے ابوداؤد نے اپنی مصنف وغیرہ میں نقل کیا ہے۔

اور انہوں نے یہ اشعار بھی کہے ہیں:

ولا تمش فوق الأرض إلاّ تواضعا فكم تحتها قوم همومنك أرفعُ

تو زمین کے اوپر تواضع اور انکساری کے بغیر نہ چل پس اس کے نیچے کتنی قومیں ہیں جو تجھ سے بلند اور ارفع تھیں۔

و إن كنتَ لی عزٍّ و حِرز و مَنعة فكم مات من قوم هم منك أمنعُ

اور اگر تو عزت، حفاظت اور قوت میں ہے، تو قوم میں سے کتنے مر گئے جو تجھ سے زیادہ محفوظ اور طاقتور تھے۔

مسئلہ نمبر 2۔ انسان کا بغیر حاجت کے محض برتری اور غلبے کے اظہار کے لئے شکار کرنا بھی اس آیت میں داخل ہے، اس میں حیوان کو عذاب دینا اور اسے جاری رکھنا بغیر کسی حاجت اور مقصد کے وہ بھی داخل ہے۔ اور رہا وہ آدمی جو کسی دن اور اس دن کی کسی ساعت میں راحت و سکون حاصل کرتا ہے، اور اس میں وہ اپنے آپ کو اس مقابلے اور راحت میں قوت و طاقت باہم پہنچاتا ہے تاکہ وہ اس کے سبب نیکی اور خیر میں مشغول رہنے کے لئے مدد حاصل کر سکے، مثلاً علم پڑھنا یا نماز پڑھنا وغیرہ، تو یہ اس آیت میں داخل نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: مَرَحًا جمہور کی قرأت را کے فتحہ کے ساتھ ہے (2)۔ اور اس میں ایک گروہ کی قرأت جسے یعقوب نے بیان کیا ہے وہ اسم فاعل ہونے کی بنا پر را کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور پہلی زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ بلاشبہ تیرا یہ قول: جاء زید رکضًا تیرے قول جاء زید راکِضًا کی نسبت زیادہ بلیغ ہے، پس اسی طرح تیرا قول: مَرَحًا بھی ہے۔ اور المرح مصدر ہے لہٰذا اس میں مَرِحًا کہنے کی نسبت مبالغہ زیادہ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ یعنی تو ہرگز زمین کے اندر داخل نہیں ہو سکتا کہ تو اسے جان لے جو کچھ اس میں ہے۔ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا یعنی تو ہرگز پہاڑوں کے برابر نہیں ہو سکتا نہ اپنی طوالت و لمبائی کے ساتھ اور نہ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب فی الخیلاء فی الحرب، حدیث نمبر 2286، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 456

اپنے فخر وتکبر کے ساتھ۔ اور کہا جاتا ہے: خرق الثوب یعنی اس نے کپڑا پھاڑ دیا، اور خرق الارض اس نے زمین کاٹ دی۔ اور الخرق سے مراد زمین کی کشادگی ہے۔ یعنی تو اپنے تکبر اور زمین پر چلنے کے ساتھ زمین کو کشادہ نہیں کر سکتا، یعنی تو اپنی قدرت کے ساتھ اس مقام اور حد تک نہیں پہنچ سکتا، بلکہ تو تو ذلیل اور حقیر بندہ ہے، تو اپنے نیچے اور اپنے اوپر سے ہر طرف سے گھرا ہوا ہے، اور جو گھرا ہوا ہو وہ محصور اور ضعیف ہوتا ہے، پس تیرے لئے تکبر اور رعونت مناسب اور موزوں نہیں ہے۔ اور یہاں خرق الأرض سے مراد زمین کو نقب لگانا، اس کو پھاڑنا ہے نہ کہ اسے مسافت کے ساتھ طے کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور ازہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ ہرگز اسے کاٹ نہیں سکتا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ زیادہ بین اور واضح ہے، کیونکہ یہ الخرق سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد وسیع صحرا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: فلاں أخرق من فلان، یعنی فلاں سفر، عزت اور قوت کے اعتبار سے فلان سے زیادہ ہے۔ اور روایت کیا جاتا ہے کہ سبا نے اپنے لشکروں کے ساتھ زمین کے شرق وغرب اور اس کے میدانوں اور پہاڑوں کا چکر لگایا اور بڑے بڑے سرداروں کو قتل کیا اور قیدی بنایا...... اور اسی وجہ سے اس کا نام سبا رکھا گیا...... اور مخلوق خدا اس کے قریب ہو گئی پس جب اس نے یہ دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے تین دن الگ اور خلوت میں رہا پھر ان کی طرف نکلا تو کہا: بلاشبہ جو میں نے پایا ہے وہ کوئی بھی نہیں پا سکا میں نے ان نعمتوں کے شکر کے سبب ابتدا کو دیکھ لیا ہے، اور میں نے اس میں سورج سے زیادہ سجود کا اہل کوئی نہیں دیکھا جب وہ طلوع ہوتا ہے، نتیجتاً انہوں نے اسے سجدہ کیا اور یہی سورج کی عبادت اور پرستش کا آغاز ہے، پس یہی غرور، تکبر اور اکڑنے والوں کا انجام ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا، ذٰلِكَ یہ اشارہ امر و نہی میں سے اس تمام کی طرف ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور ذٰلِكَ واحد، جمع اور مونث و مذکر سبھی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ عاصم، ابن عامر، حمزہ، کسائی اور مسروق رحمہم اللہ تعالیٰ نے سَيِّئُهٗ، سَيِّءٌ کو ضمیر کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے (1)، اور اسی لئے فرمایا: مَكْرُوْهًا یہ کان کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور السَّيِّءُ سے مراد مکروہ (اور ناپسندیدہ) عمل ہے۔ اور یہ وہ ہوتا ہے جس سے نہ اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور نہ اس کے بارے حکم دیتا ہے۔ تحقیق اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان آیات میں یعنی وَ قَضٰى رَبُّكَ سے لے کر...... تا قولہ ...... كَانَ سَيِّئُهٗ کچھ وہ امور ذکر کئے ہیں جن کے بارے حکم دیا گیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن سے منع کیا گیا ہے۔ پس وہ سيئة سے ان تمام کے بارے خبر نہیں دے رہا کہ مامور بہ بھی منھی عنه امور میں داخل ہو جائیں۔ اس قرأت کو ابو عبید نے اختیار کیا ہے، کیونکہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ذَالِكَ كَانَ سيئاته ہے۔ اور یہ اضافت کے لئے ہی ہوتا ہے۔ ابن کثیر، نافع، اور ابو عمرو نے سيئة تنوین کے ساتھ پڑھا ہے (2) یعنی ہر وہ عمل جس سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے وہ سیئہ (برا) ہے۔ اور اسی بنا پر کلام قول باری تعالیٰ: وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا پر منقطع ہو گئی۔ پھر فرمایا: وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ، وَ لَا تَمْشِ، پھر کہا: كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ تنوین کے ساتھ کہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک قول باری

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 457 2۔ ایضاً

تعالیٰ: وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ سے لے کر اس آیت تک یہ سَیِّئَهٗ ہی ہے اس میں کوئی حسنہ اور نیکی نہیں ہے، پس انہوں نے کُلٌّ کو صرف منہی عنہ کے لئے محیط بنایا ہے نہ کہ کسی اور کے لئے۔ اور قول باری تعالیٰ: مَكْرُوْهًا۔ سَیِّئُهٗ کی صفت نہیں ہے، بلکہ یہ اس سے بدل ہے اور تقدیر کلام ہے: کان سیئة وکان مکروھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مکروھا کان کی دوسری خبر ہے اس لئے کہ اسے لفظ کل پر محمول کیا گیا ہے، اور سیئة اس سے پہلے مذکورہ تمام اشیاء میں معنی پر محمول ہے (1)۔ اور ان میں سے بعض نے کہا ہے: یہ سیئة کی صفت ہے، کیونکہ جب اس کی تانیث مونث غیر حقیقی ہے تو پھر جائز ہے کہ مذکر کیساتھ اس کی صفت لگائی جائے۔ اور ابو علی فارسی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے اور کہا ہے: بے شک مونث کو جب مذکر بنایا جائے تو پھر یہ چاہئے کہ اس کا مابعد بھی مذکر ہو، اور یہ تساہل اور سستی ہے کہ پہلے وہ فعل ہو جو مونث کی طرف منسوب ہو اور وہ ایسے صیغہ میں ہو جو مذکر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

کیا آپ شاعر کا یہ قول نہیں دیکھتے:

فلا مزنة وَدَقَتْ وَدْقَهَا ولا أرض أبقل إبقالها (2)

یہ ان کے نزدیک قبیح سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی کہنے والا کہے: أبقل أرض تو یہ قبیح نہیں ہے۔

ابو علی نے کہا ہے: لیکن قول باری تعالیٰ: مَكْرُوْهًا میں یہ جائز ہے کہ وہ سَیِّئُهٗ سے بدل ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس ضمیر سے حال ہو جو عِنْدَ رَبِّكَ میں ہے اور عِنْدَ رَبِّكَ، سیئة کی صفت کے محل میں ہو (3)۔

مسئلہ نمبر 5۔ علماء نے اس آیت سے رقص اور اس میں مشغول ہونے کی مذمت پر استدلال کیا ہے۔ امام ابو الوفاء ابن عقیل نے بیان کیا ہے: رقص سے نہی پر قرآن کریم نے نص بیان کی ہے اور فرمایا: وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اور اکڑنے والے کی مذمت بیان کی ہے۔ اور رقص شدید ترین غرور کرنا اور اترانا ہے۔ کیا ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے نبیذ کو خمر پر قیاس کیا ہے اس لئے کہ یہ دونوں چستی اور نشہ لانے میں باہم متفق ہیں، تو ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ شعر کی کاٹ اور اس کو ترنم اور سر کے ساتھ کہنے کو آلات موسیقی ستار، بانسری اور طبلے پر ان دونوں کے اجتماع اور اتفاق کے باوجود قیاس نہیں کرتے۔ تو یہ صاحب ریش سے کتنا قبیح ہے اور کیسا لگتا ہے جب وہ بوڑھا ہو، اور وہ اس سر اور کاٹ پر رقص کر رہا ہو اور تالی بجا رہا ہو، اور بالخصوص اس وقت جبکہ عورتوں اور مردوں کی آوازیں ہوں، کیا یہ اس کے لئے اچھا لگتا ہے جس کے سامنے موت، سوال، حشر اور پل صراط ہو، پھر وہ دارین میں سے ایک کی طرف جانے والا ہو، وہ رقص کے ساتھ جانوروں کے اچھلنے کی طرح اچھلتا کودتا ہے، اور عورتوں کے تالی بجانے کی طرح تالی بجاتا ہے۔ قسم بخدا! میں نے اپنی عمر میں کئی مشائخ کو دیکھا ہے کہ تبسم کے سبب ان کا کوئی دانت ظاہر نہیں ہوا چہ جائیکہ ضحک کے سبب ظاہر ہوا اس کے باوجود کہ میرا ان کے ساتھ اختلاط اور میل جول ہمیشہ رہا۔ اور ابو الفرج علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: بعض مشائخ نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مجھ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ رقص دو کندھوں کے درمیان حماقت ہے اور یہ لعب کے بغیر زائل نہیں ہوتی اس باب کا مزید بیان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 457 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 458

سورۃ الکہف وغیرہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝۳۹

”یہ ہدایات جنہیں بذریعہ وحی آپ کی طرف آپ کے رب نے بھیجا ہے دانائی کی باتوں میں سے ہیں، اور (اے سننے والے!) نہ بنا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ورنہ تجھے پھینک دیا جائے گا جہنم میں اس حال میں کہ تمہیں ملامت کی جائے گی اور دھکے دیئے جائیں گے۔“

ذٰلِكَ سے اشارہ ان آداب، قصص اور احکام کی طرف ہے جنہیں وہ سابقہ آیات متضمن ہیں جنہیں لے کر حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے، یعنی یہ ان محکم افعال میں سے ہیں جن کا تقاضا اللہ عزوجل کی حکمت اپنے بندوں کے بارے میں کرتی ہے، اور اس نے انہیں ان کے لیے محاسن اخلاق، حکمت، محکم معانی اور افعال فاضلہ کے قوانین میں سے بنایا ہے۔ پھر اپنے قول: وَلَا تَجْعَلْ کا سابقہ نواہی پر عطف کیا ہے۔ یہ خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد ہر وہ انسان ہے جس نے اس آیت کو سنا۔ اور المدحور سے مراد ذلیل ورسوا کیا گیا اور (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے) بہت دور ہٹایا گیا ہے۔ اور یہ اس سورت میں گزر چکا ہے۔ اور دعا میں کہا جاتا ہے: اللّٰھم ادحر عنا الشیطان (اے اللہ! شیطان کو ہم سے دور کردے)۔

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَ اتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝۴۰

”کیا چن لیا ہے تمہیں تمہارے رب نے بیٹوں کے لئے اور (اپنے لئے) بنا لیا ہے فرشتوں کو بیٹیاں (صد افسوس!) تم تو ایسی بات کہہ رہے ہو جو بہت سخت ہے۔“

یہ آیت ان عربوں کا رد کرتی ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں (1)، اور ان کے لئے بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیاں بھی ہیں، لیکن اس نے ارادہ یہ کیا ہے کہ کیا اس نے اپنے سوا تمہارے لئے بیٹوں کو خالص کیا ہے اور بیٹیوں کو اپنے اور تمہارے درمیان مشترک بنایا ہے۔ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا تم تو ایسی بات کہہ رہے ہو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت سخت گناہ ہے۔

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَ مَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝۴۱

”اور بلاشبہ ہم نے مختلف انداز سے بار بار بیان کیا ہے (دلائل توحید کو) اس قرآن میں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں، (بایں ہمہ) سوائے نفرت کے ان میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا۔“

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا اور بلاشبہ ہم نے بیان کیا۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے بار بار بیان کیا۔ فِيْ هٰذَا

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 105

الْقُرْاٰنِ کہا گیا ہے کہ: فی زائدہ ہے۔ اور تقدیر کلام ہے: ولقد صرفنا ھذا القرآن(1) (بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو بیان کیا)، مثلاً: اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ (الاحقاف: 15) ای اصلح ذریتی۔ (میری اولاد کی اصلاح فرما)۔ اور تصریف کا معنی ہے: کسی شی کو ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف پھیرنا۔ اور اس تصریف سے مراد بیان اور تکریر (یعنی بار بار کسی چیز کو بیان کرنا) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد مغایرت ہے یعنی ہم نے مواعظ ونصائح کے انداز کو بدل بدل کر بیان کیا تا کہ وہ غور وفکر کریں، عبرت پکڑیں اور نصیحت حاصل کریں۔ اور عام قرأت صَرَّفْنَا کثرت کے معنی کی بنا پر تشدید کے ساتھ ہے۔ اور حسن نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے(2)۔ اور قول باری تعالیٰ: فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ اس سے مراد امثال، باعث عبرت قصص، حکمتیں، مواعظ اور احکام واخبار ہیں۔ ثعلبی نے بیان کیا ہے: میں نے ابوالقاسم حسین کو امام شیخ ابوالطیب کی موجودگی میں یہ کہتے سنا ہے کہ قول باری تعالیٰ: صَرَّفْنَا کے دو معنی ہیں؛ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے (قرآن مجید کو) ایک نوع پر نہیں رکھا بلکہ وعدہ ووعید، محکم ومتشابہ، امر ونہی، ناسخ ومنسوخ اور اخبار وامثال کے متنوع انداز میں بیان کیا ہے، جیسا کہ ہواؤں کو صبا، دبور، جنوب اور شمال کی متنوع اقسام میں چلاتا ہے، اور افعال کو ماضی، مستقبل، امر، نہی، فعل وفاعل اور مفعول وغیرہ کی طرف پھیرا جاتا ہے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ اس نے اسے ایک ہی بار نازل نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ اور تدریجاً نازل کیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ (الاسراء: 106) اور اس کا معنی ہے ہم نے کثرت سے جبرئیل علیہ السلام کو آپ کی طرف بھیجا ہے: لِیَذَّكَّرُوْا (الفرقان: 50) یحییٰ، اعمش، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ کی قرأت لِیَذْكُرُوْا تخفیف کے ساتھ ہے(3)۔ اور اسی طرح فرقان حمید میں ہے: وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَیْنَهُمْ لِیَذَّكَّرُوْا (الفرقان: 50) اور باقیوں نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابوعبیدہ نے اسے اختیار کیا ہے، کیونکہ اس کا معنی لیتذکروا ولیتعظوا (تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں) ہے۔

مہدوی نے کہا ہے: جنہوں نے لِیَذَّكَّرُوْا کو شد دی ہے، انہوں نے اس سے تدبر کرنے اور غور وفکر کرنے کا معنی مراد لیا ہے۔ اور اسی طرح جنہوں نے لِیَذْكُرُوْا پڑھا ہے۔ اور پہلے کی نظیر یہ ارشاد ہے: وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (القصص) (اور ہم مسلسل بھیجتے رہے ان کی طرف اپنا کلام تا کہ وہ نصیحت قبول کریں)۔ اور دوسرے کی نظیر وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ (البقرہ: 63) ہے۔

وَمَا یَزِیْدُهُمْ یعنی بار بار بیان کرنے اور نصیحت کرنے نے ان میں اضافہ نہیں کیا۔ اِلَّا نُفُوْرًا مگر حق سے دور کرنے اور نظر وفکر سے غفلت برتنے کا، اور یہ اس لئے ہوا کیونکہ انہوں نے قرآن کریم کے بارے یہ اعتقاد رکھا کہ یہ محض حیلہ، سحر، کہانت اور شعر ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا یَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا ۝
سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِیْرًا ۝

"آپ فرمایئے: اگر ہوتے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور خدا جس طرح یہ کافر کہتے ہیں تو ان خداؤں نے (مل کر)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 458 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

تلاش کرلی ہوتی عرش کے مالک (پر غالب آنے کی) کوئی راہ۔ وہ پاک ہے اور وہ بہت برتر و بالا ہے ان باتوں
سے جو یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ یہ اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے: وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا (الاسراء: 29) اور یہ بتوں کی پرستش کرنے والوں کا رد ہے۔ كَمَا يَقُوْلُوْنَ ابن کثیر اور حفص نے يَقُوْلُوْنَ یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تقولون خطاب کی بنا پر تا کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ اِذًا لَّابْتَغَوْا یعنی ان الہٰوں نے تلاش کرلی ہوتی۔ اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جھگڑا کرنے اور جنگ کرنے کا مطالبہ کرتے جیسا کہ دنیا کے بادشاہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تب انہوں نے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی کوئی راہ تلاش کرلی ہوتی (2) تا کہ وہ اس کی بادشاہی کو زائل اور ختم کرسکیں، کیونکہ وہ اس کے شریک ہیں۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تب ان خداؤں نے صاحب عرش کے پاس قرب کی راہ تلاش کرلی ہوتی، اور اس کی نزدیکی تلاش کرچکے ہوتے کیونکہ وہ اس کے سوا ہیں، اور قوم یہ اعتقاد رکھتی ہے کہ وہ بت انہیں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب کردیتے ہیں، پس جب انہوں نے بتوں کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا کہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے محتاج ہیں تو پھر یہ باطل ہوگیا کہ وہ الٰہ ہیں۔ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی ہر اس شے سے پاکی، عظمت اور بزرگی بیان کی ہے جو اس کے لائق اور مناسب نہیں۔ اور تسبیح کا معنی تنزیہ (پاکی بیان کرنا) ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝

"پاکی بیان کرتے ہیں اس کی ساتوں آسمان اور زمین اور جو چیز ان میں موجود ہے، اور (اس کائنات میں) کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اس کی حمد کرتے ہوئے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے، بے شک وہ بہت بردبار، بہت بخشنے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ اس میں آسمانوں اور زمین کی طرف ذوی العقول کی ضمیر لوٹ رہی ہے، اس لئے کہ ان کی طرف عاقل کا فعل منسوب کیا گیا ہے اور وہ تسبیح کرنا ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَ مَنْ فِيْهِنَّ میں مراد فرشتے، انسان اور جنات ہیں، پھر اس کے بعد تمام اشیاء کو اپنے اس قول میں شامل کیا: وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ اور اس عموم میں اختلاف ہے، کیا یہ مخصص ہے یا نہیں؟ تو ایک فرقہ اور جماعت نے کہا ہے: یہ عام مخصوص نہیں ہے اور اس سے مراد تسبیح الدلالۃ ہے۔ اور ہر پیدا ہونے والی اور بنائی جانے والی شے اس کی ذات پر یہ شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق بھی ہے اور قادر بھی۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: یہ تسبیح حقیقی ہے، اور علی العموم ہر شے ایسی تسبیح بیان کرتی ہے جسے انسان نہ سن سکتا ہے اور نہ اسے سمجھ سکتا ہے، اور اگر مراد وہ ہو جو پہلے فریق نے کہا ہے کہ مراد صنعت کا اثر اور دلالت ہے تو یقیناً یہ ایسا امر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 459
2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 106

ہے جو سمجھا جاسکتا ہے، اور آیت یہ بیان کر رہی ہے کہ یہ تسبیح سمجھی نہیں جاسکتی (1)۔ اور انہیں جواب یہ دیا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ: لَّا تَفْقَهُوْنَ سے مراد وہ کفار ہیں جو غور و خوض کرنے سے منہ پھیر لیتے ہیں پس وہ اشیاء میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: قول باری تعالیٰ: مِّنْ شَيْءٍ میں عموم ہے لیکن اس کا معنی ہر زندہ اور نامی (بڑھنے والا) کے ساتھ خاص ہے، اور یہ جمادات کو شامل نہیں، اسی سے عکرمہ کا قول ہے: درخت تسبیح بیان کرتے ہیں اور ستون تسبیح بیان نہیں کرتے (2)۔ یزید رقاشی نے حسن کو کہا اور یہ دونوں کھانے پر تھے اس حال میں کہ دسترخوان سامنے بچھا ہوا تھا: اے ابا سعید! کیا یہ دسترخوان بھی تسبیح بیان کرتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ ایک بار تسبیح بیان کرتا ہے؛ مراد یہ ہے کہ درخت اپنے پھلدار ہونے اور اپنے اعتدال کے زمانے میں تسبیح بیان کرتا ہے، لیکن اب یہ عمدہ خوشبودار دسترخوان بن چکا ہے (3)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس قول کے لئے اس سنت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ ان دونوں قبر والوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور کسی بڑے گناہ میں انہیں عذاب نہیں دیا جا رہا ہے، ان میں سے ایک چغلخوری کرتا تھا اور رہا دوسرا! تو وہ پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تر ٹہنی منگائی اور اس کے دو حصے کر دیئے، پھر ایک حصہ ایک قبر پر گاڑ دیا اور دوسرا دوسری قبر پر گاڑ دیا۔ پھر ارشاد فرمایا: "ان سے عذاب ہلکا کر دیا جائے گا جب تک یہ خشک نہیں ہوں گے۔" پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: مالم ییبسا (4) (جب تک یہ خشک نہ ہوئے) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں حصے جب تک تر رہیں گے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے رہیں گے، اور جب خشک ہو جائیں گے تو جماد ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

اور مسند ابی داؤد طیالسی میں ہے: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف ایک پر اور نصف دوسری پر رکھ دی اور فرمایا: "ان دونوں پر عذاب ہلکا اور نرم کر دیا جائے گا جب تک ان دونوں میں ان کی تری میں سے کوئی شے رہی۔" (لعله أن یهون علیهما العذاب ما دام فیهما من بلولتهما شئ) ہمارے علماء نے کہا ہے: اسی سے قبروں پر درخت لگانا اور قرآن کریم پڑھنا مستفاد ہوتا ہے، جب درختوں کے سبب ان سے تخفیف کر دی جاتی ہے تو پھر ایک مومن آدمی کے قرآن کریم پڑھنے سے کیسے نہیں ہوگی۔ ہم نے اس کا مفصل اور شافی بیان "کتاب التذکرہ" میں کیا ہے، اور یہ بھی کہ میت کو جو ثواب ہدیہ اور تحفہ بھیجا جاتا ہے وہ اس تک پہنچ جاتا ہے۔ والحمد للہ علی ذالك۔ اور دوسری تاویل کی بنا پر اس کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ اس کے مطابق ہر شے چاہے جماد ہو یا غیر جماد وہ تسبیح بیان کرتی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل اور اس قول کے لئے کتاب اللہ سے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا جاتا ہے: وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ۝ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۝ (ص) (یاد فرماؤ ہمارے بندے داؤد کو جو بڑا طاقتور تھا۔ وہ (ہماری طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا۔ ہم نے فرمانبردار بنا دیا تھا پہاڑوں کو وہ ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے عشاء اور اشراق کے وقت۔) اور قول باری تعالیٰ: وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (البقرہ: 74) (اور کئی ایسے بھی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 459 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 1980

ہیں جو گر پڑتے ہیں خوف الہٰی سے)۔ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ہے۔ اور قول باری تعالیٰ ہے: وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۙ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ (مریم) (پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے، کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا ایک بیٹا ہے۔)

اور ابن مبارک نے (اپنی دقائق) میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں مسعر نے عبداللہ بن واصل سے انہوں نے عوف بن عبداللہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: بے شک ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کو کہتا ہے: اے فلاں! کیا تیرے پاس سے آج کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا گزرا ہے؟ پس اگر وہ کہے: ہاں، تو اس کے سبب اسے انتہائی مسرت اور خوشی ہوتی ہے۔ پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ الآیہ (مریم) (اور کفار کہتے ہیں: بنالیا ہے رحمٰن نے (فلاں کو اپنا) بیٹا)۔ فرمایا: کیا تم انہیں دیکھ رہے ہو وہ جھوٹ سن سکتے ہیں اور خیر اور نیکی کی بات نہیں سن سکتے۔ اور اسی بارے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: کوئی صبح اور شام نہیں مگر زمین کے ٹکڑے آپس میں ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں: اے میرے پڑوسی! کیا آج تیرے پاس سے کوئی ایسا بندہ گزرا ہے جس نے تجھ پر اللہ تعالیٰ کے لئے نماز پڑھی ہو یا اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا ہو؟ تو ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں: نہیں اور بعض کہتے ہیں: ہاں، پس جب وہ ہاں کہے تو وہ اس کے سبب اسے اپنے سے افضل دیکھتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤذن کی آواز جن وانس، شجر وحجر، مٹی کا ڈھیلا یا اور کوئی شے نہیں سنتی مگر وہ قیامت کے دن اس کے لئے شہادت اور گواہی دیں گے (1)۔ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: تحقیق ہم کھانے کی تسبیح سنتے تھے حالانکہ وہ کھایا جارہا ہوتا تھا۔ اور اس روایت کے علاوہ دوسری روایت میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں کھانا کھا رہے تھے اور ہم اس کی تسبیح سن رہے تھے (2)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ میں مکہ مکرمہ میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری بعثت سے پہلے مجھ پر سلام کیا کرتا تھا بلاشبہ میں اب بھی اسے پہچانتا ہوں (3)''۔ کہا گیا ہے کہ وہ حجر اسود ہے۔ واللہ اعلم۔ اس بارے میں بہت سی اخبار ہیں اور ہم ان میں سے بہت سی روایات پر اللمع اللؤلؤية فی شرح العشرینیات النبویہ للفاداری رحمہ اللہ تعالیٰ میں آگاہ ہوئے ہیں۔ اور اسی بارے میں جذع (یعنی کھجور کے تنا) والی روایت بھی مشہور ہے۔ جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ اور جب یہ ایک جماد میں ثابت ہے تو پھر دیگر جمادات میں بھی اس کا پایا جانا جائز ہے، اور اس میں سے کوئی شے بھی محال نہیں ہے، پس اس عموم کی بنا پر ہر شے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ اسی طرح حضرت نخعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: یہ ان تمام چیزوں کو بھی عام اور شامل ہے۔ اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، رفع الصوت بالنداء من حديث ابی سعید خدری، جلد 1، صفحہ 85

ایضاً، سنن ابن ماجہ، حدیث 714، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ جامع ترمذی، باب البرکۃ فی الماء، حدیث نمبر 3566، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، فضل نسب النبی صلی اللہ علیہ وسلم و تسلیم الحجر علیہ قبل النبوۃ، جلد 2، صفحہ 245

انہوں نے انہیں اخبار سے استدلال کیا ہے جو ہم نے ذکر کی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جمادات کی تسبیح یہ ہے کہ وہ اپنی طرف دیکھنے والے کو یہ کہنے کی دعوت دیتی ہیں: سبحان اللہ! کیونکہ ان میں ادراک نہیں ہوتا۔

اور شاعر کا قول بھی ہے:

تُلْقِی بتسبیحة من حیث ما انصرفت و تَستقِر حَشَا الرائی بِتَرْعَادِ (1)

یعنی جو انہیں دیکھتا ہے وہ کہتا ہے: سبحان خالقها (انہیں تخلیق فرمانے والے کی ذات پاک ہے)۔

پس صحیح یہ ہے کہ تمام چیزیں تسبیح بیان کرتی ہیں کیونکہ اخبار و روایات اس پر دلالت کرتی ہیں، اور اگر وہ تسبیح تسبیح الدلالة ہی ہوتو پھر داؤد کی تخصیص کون سی ہے؟ بلاشبہ وہ تسبیح مقال ہے اللہ تعالیٰ کے ان میں حیات اور زندگی پیدا کرنے کے ساتھ اور تسبیح کے ساتھ بولنے کی قوت عطا کرنے کے ساتھ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اور سنت اس پر نص ہے جس پر ہر شے کے تسبیح بیان کرنے میں سے قرآن کریم کا ظاہر دلالت کرتا ہے پس اس کے ساتھ کلام کرنا اولیٰ اور بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔ حسن، ابوعمر، یعقوب، حفص، حمزہ، کسائی اور خلف نے تفقهون فاعل کے مونث ہونے کی وجہ سے تا کے ساتھ قرأت کی ہے۔ باقیوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے، اور ابو عبید نے اسے ہی اختیار کیا ہے، انہوں نے کہا: فعل اور تانیث کے درمیان فاصلہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا بے شک وہ دنیا میں اپنے بندوں کے گناہوں سے حلم کا اظہار کرنے والا ہے۔ غَفُوْرًا اور آخرت میں مومنوں کو بخشنے والا ہے۔

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

''اور (اے محبوب!) جب آپ پڑھتے ہیں قرآن کو تو ہم (حائل) کر دیتے ہیں آپ کے درمیان اور ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک پوشیدہ پردہ جو آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے۔''

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب سورہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ (لہب: 1) نازل ہوئی تو کانی ام جمیل بنت حرب آئی وہ بڑے جوش اور غصے میں تھے اور اس کے ہاتھ میں پتھر تھا اور وہ کہہ رہی تھی: مُذَمَّمًا عَصَيْنَا (ہم نے مذمم کی نافرمانی کی) وأَمْرَهٗ أَبَيْنَا (ہم نے اس کے حکم کا انکار کیا) وَدِيْنَهٗ قَلَيْنَا (اور ہم نے اس کے دین کو ناپسند کیا)۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی تھے، پس جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھا تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ آ رہی ہے اور مجھے خوف ہے کہ وہ آپ کو دیکھ لے گی! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انها لن ترانی (2) (بے شک وہ مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکے گی) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کریم پڑھا اور اس کے ساتھ محفوظ رہے جیسے آپ نے فرمایا تھا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا پس وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 245
2۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، سورۂ تبت، جلد 7، صفحہ 302، حدیث 11529

رکی اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا اور کہنے لگی: اے ابا بکر! مجھے خبر دی گئی ہے کہ تیرے ساتھی نے میری ہجو کی ہے! تو آپ نے فرمایا: نہیں اس گھر کے رب کی قسم انہوں نے تیری ہجو نہیں کی۔ آپ فرماتے ہیں: پس وہ واپس مڑی تو یہ کہہ رہی تھی: تحقیق قریش جانتے ہیں کہ میں ان کے سردار کی بیٹی ہوں۔

اور حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: جب تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ (لہب) نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: کاش آپ اس سے دور ہٹ جائیں تاکہ وہ آپ کو کوئی ایسا کلمہ نہ سنا دے جو آپ کو اذیت اور تکلیف پہنچائے، کیونکہ یہ فحش بکنے والی عورت ہے۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انه سيحال بيني و بينها (1) (بلاشبہ میرے درمیان اور اس کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیا جائے گا) پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھ سکی۔ اور اس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے ابا بکر! تیرے ساتھی نے میری ہجو بیان کی ہے! تو آپ نے فرمایا: قسم بخدا! نہ وہ شعر بناتے ہیں اور نہ شعر کہتے ہیں۔ تو اس نے کہا: بلاشبہ آپ تو ان کی تصدیق کرتے ہیں، پھر وہ وہیں سے واپس لوٹ گئی، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اس نے آپ کو نہیں دیکھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "نہیں۔ میرے اور اس کے درمیان حائل ہو کر فرشتے نے مجھے مسلسل ڈھانپے رکھا یہاں تک کہ وہ چلی گئی۔" (لا۔ مازال ملك بيني و بينها يسترني حتى ذهبت) اور حضرت کعب نے اس آیت کے تحت کہا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تین آیات کے ساتھ مشرکین کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے: ایک آیت وہ ہے جو سورہ انعام میں ہے: وَّجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (الانعام: 25) (ہم نے ڈال دیئے ان کے دلوں پر پردے تاکہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی۔) اور ایک آیت وہ ہے جو سورہ نحل میں ہے: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ (النحل: 108) (یہ وہ لوگ ہیں مہر لگا دی ہے اللہ تعالیٰ نے جن کے دلوں، جن کے کانوں اور جن کی آنکھوں پر۔) اور ایک آیت وہ ہے جو سورۂ جاثیہ میں ہے: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً الآیہ۔ (الجاثیہ: 23) (ذرا اس کی طرف تو دیکھو جس نے بنا لیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو اور گمراہ کر دیا ہے اسے اللہ نے باوجود علم کے اور مہر لگا دی ہے اس کے کانوں اور اس کے دل پر اور ڈال دیا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ۔) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب یہ آیات پڑھ لیتے تھے تو مشرکین سے اوجھل ہو جاتے تھے، حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں نے ان کے بارے اہل شام میں سے ایک آدمی کو بتایا، پس وہ روم آ گیا اور وہیں طویل عرصہ تک قیام پذیر رہا، پھر وہاں سے بھاگ نکلا تو وہ لوگ اس کی تلاش میں نکلے تو اس نے یہی آیات پڑھ لیں تو وہ اس طرح ہو گئے کہ راستے میں اس کے ساتھ ہونے کے باوجود اسے دیکھ نہ سکتے تھے۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہی ہے جسے وہ حضرت کعب سے اس طرح روایت کرتے ہیں کہ میں نے اس کے بارے اہل الری میں سے ایک آدمی کو بتایا اور وہ دیلم میں قید ہو گیا کافی عرصہ وہاں ٹھہرا رہا پھر وہاں سے

1۔ مجمع الزوائد، کتاب التفسیر، سورۂ تبت، جلد 7، صفحہ 302، حدیث 11529

بھاگ نکلا تو وہ اس کی تلاش میں نکلے تو اس نے یہ آیات پڑھ لیں۔ یہاں تک کہ ان کے کپڑے اس کے کپڑوں کے ساتھ مس ہونے لگے لیکن وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہم ان آیات میں سورۂ یٰسین کی ابتدا سے لے کر فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ تک کا اضافہ کرتے ہیں، کیونکہ سیرت میں حضور نبی مکرم ﷺ کے ہجرت فرمانے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آپ کے بستر پر آرام فرمانے کا تذکرہ موجود ہے اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور ایک مشت مٹی اپنے ہاتھ میں اٹھائی، اور اللہ عزوجل نے ان کی آنکھوں پر آپ کو دیکھنے سے پردہ ڈال دیا۔ پس وہ آپ ﷺ کو نہ دیکھ سکے، اور آپ نے وہ مٹی ان کے سروں پر پھینک دی اور آپ سورۂ یٰسین کی یہ آیت پڑھتے رہے: يٰسٓ ۝ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰۤى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۝ وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ ان آیات سے فارغ ہو گئے، اور ان میں سے کوئی آدمی باقی نہ رہا جس کے سر پر مٹی نہ پڑی ہو، پھر آپ اس طرف چلے گئے جہاں جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ہمارے علاقے اندلس میں اعمال قرطبہ میں حصن منثور کے ساتھ اسی طرح کا واقعہ مجھے پیش آیا، وہ یہ کہ میں دشمن کے سامنے سے بھاگ گیا اور میں اس سے ایک طرف پیچھے ہٹ گیا، پس ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ دو گھڑسوار میری تلاش میں نکل پڑے اور میں زمین کی کھلی فضا میں بیٹھا ہوا تھا اور کوئی چیز مجھے ان سے چھپانے اور ڈھانپنے والی نہ تھی، اور میں سورۂ یٰسین شروع سے اور علاوہ ازیں قرآن کریم کی آیات پڑھنے لگا، تو وہ دونوں مجھ سے آگے گزر گئے پھر اسی جگہ سے واپس لوٹے تو ان میں سے ایک دوسرے کو کہہ رہا تھا یہ تو دِيْبَلَه یعنی شیطان (جن) ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا اور وہ مجھے نہ دیکھ سکے، والحمد لله حمدا كثيرا على ذالك۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ پردہ (مستور) ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی مہر ہے یہاں تک کہ نہ وہ اسے سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس میں موجود حکمت کا ادراک کر سکتے ہیں۔ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یعنی یہ کہ ان کے آپ کی قرأت سے اعراض کرنے اور آپ سے تغافل برتنے کے سبب یہ اس طرح ہے کہ آپ کے درمیان اور اس کے درمیان آپ کو نہ دیکھنے کے بارے میں حجاب اور پردہ ہے گویا ان کے دلوں پر پردہ سا پڑ گیا ہے (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت اس قوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچاتے تھے جب آپ قرآن کریم پڑھتے تھے، اور وہ ابوجہل، ابوسفیان، نضر بن حارث، ابولہب کی بیوی ام جمیل، اور حویطب تھے، پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو قرآن کریم پڑھنے کے وقت ان کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا، چھپا دیا۔ وہ آپ ﷺ کے پاس سے گزرتے تھے اور آپ کو دیکھتے نہ تھے؛ یہ زجاج وغیرہ نے کہا ہے۔ اور یہی پہلے قول کا بعینہ معنی ہے، اور

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 29

یہی آیت میں اظہر ہے۔ واللہ اعلم۔ اور قول باری تعالیٰ: مَّسْتُوْرًا اس میں دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ حجاب تم سے چھپا ہوا ہے تم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ اور دوسرا یہ ہے ..... کہ حجاب تم سے اپنے ورا کو چھپانے اور ڈھانپنے والا ہے اور اس صورت میں مستور بمعنی ساتر ہوگا(1)۔

وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝

''اور ہم ڈال دیتے ہیں ان کے دلوں پر پردہ تاکہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی (پیدا کر دیتے ہیں) اور جب آپ ذکر کرتے ہیں صرف اپنے رب کا قرآن میں تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں نفرت کرتے ہوئے۔''

قولہ تعالیٰ: وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً، أَكِنَّة، كِنَان کی جمع ہے، اور اس سے مراد ہر وہ شے ہے(2) جو کسی شے کو ڈھانپ لے۔ اس کا ذکر سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے۔ اَنْ يَّفْقَهُوْهُ یعنی تاکہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں، یا اس کے سمجھنے کو ناپسند کریں، یعنی اس میں اوامر ونواہی اور حکم ومعانی میں سے جو کچھ ہے اسے سمجھنا (انہیں ناپسند ہو) یہ قدر یہ کا رد ہے۔

وَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا اور ان کے کانوں میں بہرہ پن اور گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کلام میں اضمار ہے یعنی أن يسمعوه (کہ وہ اسے سن سکیں)۔ وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ یعنی آپ کہیں: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اس حال میں کہ آپ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہوں۔ اور ابوالجوزاء اوس بن عبداللہ نے کہا ہے: کوئی شے نہیں ہے جو لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے قول سے بڑھ کر شیطان کو دل سے بھگانے والی ہو، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: وَ اِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا اور علی بن حسین نے کہا ہے: اس سے مراد آپ کا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہنا ہے۔ اس کا ذکر پہلے بسم اللہ شریف کی بحث میں گزر چکا ہے۔ وَلَّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا کہا گیا ہے: اس سے مشرکین مراد لئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شیاطین مراد ہیں۔ اور نُفُوْرًا یہ نافر کی جمع ہے، جیسا کہ شهود، شاهد کی جمع ہے، اور قعود، قاعد کی جمع ہے۔ اور یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر ہو جو فعل کے الفاظ کے سوا ہے، جبکہ قول باری تعالیٰ: وَلَّوْا بمعنی نفروا ہو اور اس کا معنی یہ ہو نفروا نفورًا۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝

''ہم خوب جانتے ہیں جس غرض کے لئے یہ سنتے ہیں اسے جب یہ کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور (ہم خوب جانتے ہیں) جب یہ سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اس وقت یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم نہیں پیروی کر رہے مگر ایک ایسے آدمی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 460 2۔ ایضاً

کی جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَسۡتَمِعُوۡنَ بِہٖۤ اِذۡ یَسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡکَ کہا گیا ہے: قول باری تعالیٰ بِہٖۤ میں با زائدہ ہے مراد ہے یستمعونہ (یعنی ہم اس کے بارے خوب جانتے ہیں جس کے لئے یہ اسے سنتے ہیں) اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم سنتے تھے پھر نفرت کا اظہار کرتے تھے اور کہتے تھے: یہ ساحر (جادوگر) ہے اور اس پر جادو کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سے اس کے بارے خبر دی ہے؛ یہ حضرت قتادہ وغیرہ نے کہا ہے۔ وَ اِذۡ ہُمۡ نَجۡوٰۤی یعنی (ہم خوب جانتے ہیں) جب وہ آپ کے معاملے میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ان کی سرگوشیاں ان کا یہ قول ہوتا تھا: بے شک یہ مجنون ہے، بے شک یہ ساحر ہے، اور بے شک یہ پہلے لوگوں کے افسانے لاتا ہے(1)، اور اس طرح کی اور باتیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب عتبہ نے معززین قریش کو کھانے پر بلایا جو اس نے ان کے لئے تیار کیا، پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں تشریف لے گئے اور ان پر قرآن کریم پڑھا اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا، تو وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے اور کہنے لگے: یہ جادوگر اور مجنون ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ کھانے کا اہتمام کریں اور مشرکین میں سے اشراف قریش کو اس کی دعوت دیں، پس حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دعوت کا اہتمام کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان پر قرآن کریم پڑھا اور انہیں توحید کی طرف دعوت دی، اور فرمایا: "کہو لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یقیناً عرب تمہارا مطیع ہو جائے گا اور اہل عجم تمہارا دین قبول کر لیں گے۔" لیکن انہوں نے انکار کر دیا، وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنتے تھے اور پھر آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے کہتے تھے: یہ تو جادوگر ہے اور اس پر جادو کر دیا گیا ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور زجاج نے کہا ہے: النجوی اسم مصدر ہے، یعنی اذھم ذو نجوی (جب وہ سرگوشیاں کر رہے ہوتے ہیں) اِذۡ یَقُوۡلُ الظّٰلِمُوۡنَ اس سے مراد ابو جہل، ولید بن مغیرہ اور ان جیسے دیگر لوگ ہیں۔ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا (کہ تم پیروی نہیں کر رہے مگر ایسے آدمی کی) جس پر جادو کر دیا گیا ہے بتحقیق سحر (جادو) نے اسے خراب کر دیا ہے اور اس پر اس کا معاملہ خلط ملط ہو چکا ہے، وہ یہ اس لئے کہتے تھے تا کہ لوگ آپ سے بھاگ جائیں (نفرت کرنے لگیں)۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مَّسۡحُوۡرًا اس کا معنی ہے دھوکا دیا ہوا مثلاً قول باری تعالیٰ ہے: فَاَنّٰی تُسۡحَرُوۡنَ ﴿۸۹﴾ (المومنون) یعنی کہاں سے تمہیں دھوکا دیا جا رہا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: مَّسۡحُوۡرًا اس کا معنی ہے کہ ان کے تابع ایک جن ہے، لہٰذا وہ کھانے پینے سے مستغنی نہیں ہیں، پس وہ تمہاری ہی مثل ہیں اور وہ فرشتہ نہیں ہیں۔ اور عرب بزدل آدمی کے لئے کہتے ہیں: قد انتفخ سحرہ (وہ تو بزدل اور ڈرپوک نکلا)۔ آدمی وغیرہ میں سے جو بھی کھائے یا پیئے اسے مسحور اور مُسَحَّر کہا جاتا ہے۔ لبید نے کہا ہے:

فإن تسألینا فیم نحن فإننا عصافیر من هذا الأنام المُسَحَّرِ(2)

اور امرء القیس نے کہا ہے:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 247 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 461

أرانا　مُوضِعِين　لأمرٍ　غَيْبٍ　وَ نُسحَرُ بالطعام و بالشَّراب(1)

یعنی ہم کھانا کھلائے جاتے ہیں اور بار بار پلائے جاتے ہیں۔

اور حدیث طیبہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: کون ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے میرے مقابلے میں فخر کر سکتی ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے کے ساتھ لگے ہوئے وصال فرمایا(2)۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾

”دیکھئے (یہ گستاخ) کس طرح آپ کے لئے مثالیں بیان کرتے ہیں پس (اس گستاخی کے باعث) وہ گمراہ ہو گئے اب وہ سیدھے راستہ پر چل نہیں سکتے۔“

قولہ تعالیٰ: اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ یہ ان کے عمل اور کارستانی پر اظہار تعجب کیا ہے کہ وہ کبھی کہتے ہیں: یہ جادوگر ہے اور کبھی کہتے ہیں: یہ مجنون ہے اور کبھی کہتے ہیں: یہ شاعر ہے۔ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا پس وہ لوگوں کو آپ سے روکنے کا حیلہ کر کے گمراہ ہو گئے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ حق سے گمراہ ہو گئے ہیں پس اب وہ ہدایت کی طرف لے جانے والے راستے کو نہیں پا سکتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ (گمراہی سے) نکلنے کی راہ نہیں پا سکتے کیونکہ ان کے قول میں ان کا کلام متناقض ہے، یعنی وہ کبھی مجنون، کبھی ساحر اور کبھی شاعر کہتے ہیں۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾

”اور انہوں نے (ازراہ انکار) کہا کہ جب ہم (مر کر) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہمیں اٹھایا جائے گا از سر نو پیدا کر کے۔“

قولہ تعالیٰ: اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا یعنی انہوں نے یہ کہا اس حال میں کہ وہ سرگوشیاں کر رہے تھے جب انہوں نے قرآن کریم سنا اور دوبارہ زندہ کئے جانے کا حکم سنا کہ اگر یہ جادو کیا ہوا اور دھوکا دیا ہوا نہ ہوتا تو یہ اس طرح نہ کہتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: الرفات کا معنی غبار ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی تراب (مٹی) ہے(3)۔ اور الرفات ہر وہ شے جو ریزہ ریزہ ہو جائے اور ہر وہ شے جو بوسیدہ اور پرانی ہو جائے، جیسا کہ فُتات، حُطام اور رُضاض (تینوں کا معنی ٹوٹی ہوئی چیز کے ٹکڑے اور چورا ہے۔) یہ ابو عبیدہ، کسائی، فراء اور اخفش سے منقول ہے، اسی سے تو کہتا ہے: رُفِتَ الشیٔ رَفْتًا، یعنی چیز کو توڑ دیا گیا فھو مرفوت (پس وہ ٹوٹی ہوئی ہے) اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا، اَئِنَّا استفہام ہے اور اس سے مراد جحد اور انکار ہے۔ اور خَلْقًا منصوب ہے کیونکہ یہ مصدر ہے، یعنی بعثًا جدیدًا (نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھانا، تو یہ مفعول مطلق ہے۔) اور یہ ان کی طرف سے حد درجے کا انکار ہے۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 461　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 462

مَنۡ یُّعِیۡدُنَا ؕ قُلِ الَّذِیۡ فَطَرَکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ۚ فَسَیُنۡغِضُوۡنَ اِلَیۡکَ رُءُوۡسَہُمۡ وَ یَقُوۡلُوۡنَ مَتٰی ہُوَ ؕ قُلۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ قَرِیۡبًا ﴿۵۱﴾

''فرمائیے (یقیناً ایسا ہی ہوگا) خواہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا بن جاؤ۔ یا کوئی ایسی مخلوق بن جاؤ جس کا از سرنو پیدا کرنا تمہارے خیال میں بہت مشکل ہے، وہ کہیں گے: ہمیں دوبارہ کون (زندہ کر کے) لوٹائے گا؟ فرمائیے: وہی جس نے پیدا فرمایا تمہیں پہلی مرتبہ، پس وہ حیرت سے آپ کی طرف (دیکھ کر) سروں کو جنبش دیں گے اور پوچھیں گے: ایسا کب ہوگا؟ آپ بتائیے: شاید اس کا وقت قریب ہی ہو۔''

قولہ تعالیٰ: قُلۡ کُوۡنُوۡا حِجَارَۃً اَوۡ حَدِیۡدًا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرمائیے (اگرچہ) تم عاجز کرنے کی جہت سے تم شدت اور قوت میں پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ (تب بھی ایسا ہی ہوگا۔) علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر تمہیں اس پر تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ہڈیاں اور گوشت پیدا کرے گا تو تم پتھر یا لوہا ہو جاؤ اگر تم قدرت رکھتے ہو(1)۔ اور علی بن عیسیٰ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ تم اگر پتھر یا لوہا بھی ہوئے تو تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے جب اس نے تمہارا ارادہ کر لیا، مگر یہ کلام امر کے محل میں ہے، کیونکہ الزام میں یہ زیادہ بلیغ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر تم پتھر یا لوہا بھی ہوئے تو وہ یقیناً تمہیں دوبارہ اٹھائے گا جیسے اس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے، اور وہ یقیناً تمہیں موت دے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا(2)۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تم جو چاہو ہو جاؤ تم عنقریب دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے کیونکہ وہ یہ استطاعت اور طاقت نہیں رکھتے کہ وہ پتھر ہو جائیں۔ اور بلاشبہ اس کا معنی یہی ہے کہ انہوں نے اپنے خالق کے بارے اقرار کر لیا اور دوبارہ زندہ کئے جانے کا انکار کیا تو انہیں کہا گیا کہ یہ سمجھ لو کہ تم جو چاہو ہو جاؤ، پس اگر تم پتھر یا لوہا بھی ہوئے تو بھی تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے جس طرح پہلی بار پیدا کئے گئے۔ اَوۡ خَلۡقًا مِّمَّا یَکۡبُرُ فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد آسمان، زمین اور پہاڑ ہیں کیونکہ لوگوں کے خیال میں یہ بڑے عظیم ہیں(3)۔ اور یہی معنی حضرت قتادہ کے قول کا ہے۔ وہ کہتے ہیں: تم جو چاہو ہو جاؤ، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہیں موت دے گا اور پھر تمہیں دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے گا۔ اور حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، ابن جبیر، مجاہد نے بھی، عکرمہ، ابو صالح، اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: مراد موت ہے، کیونکہ ابن آدم (انسان) کے خیال میں اس سے بڑی اور کوئی شے نہیں ہے، جیسا کہ امیہ بن ابی صلت نے کہا ہے:

وللموت خلق فی النفوس فظیع(4) (لوگوں کے خیال میں موت خوفناک مخلوق ہے۔)

اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: بے شک تم اگر پتھر یا لوہے سے پیدا کئے جاتے یا تم موت ہوتے تو میں ضرور تمہیں موت دوں گا اور یقیناً تمہیں دوبارہ اٹھاؤں گا، کیونکہ وہ قدرت جس کے ساتھ میں نے تمہیں پیدا کیا ہے اسی کے ساتھ تمہیں دوبارہ اٹھاؤں گا۔ اور یہی معنی ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا: فَسَیَقُوۡلُوۡنَ مَنۡ یُّعِیۡدُنَا ؕ قُلِ الَّذِیۡ فَطَرَکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ اور حدیث میں ہے

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 113 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 248 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

کہ ''قیامت کے دن چتکبرے مینڈھے کی صورت میں موت کو لایا جائے گا اور اسے جنت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا'' اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد بعث (دوبارہ زندہ کیا جانا) ہے، کیونکہ لوگوں کے خیال میں یہی سب سے بڑی شے ہے؛ یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ فَطَرَكُمْ جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں بنایا۔ فَسَيُنْغِضُونَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ یعنی وہ بطور استہزا اپنے سروں کو حرکت دیتے ہیں؛ کہا جاتا ہے: نَغَض رأسه يَنْغَض ويَنْغِض نَغْضاً وَ نُغُوضاً، یعنی اس کے سر نے حرکت کی۔ اور أنغض رأسه یعنی اس نے اپنے سر کو ہلایا، حرکت دی، اس طرح جیسا کہ کوئی کسی شے سے تعجب کرنے والا کرتا ہے۔

اور اسی سے قول باری تعالیٰ ہے: فَسَيُنْغِضُونَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ۔

راجز کا قول ہے: أنغض نحوى رأسه وأقنعا(1) (اس نے میری طرف اپنے سر کو ہلایا اور اسے اوپر اٹھا لیا) اور یہ بھی کہا جاتا ہے: نَغَضَ فلان رأسه (یعنی فلاں نے اپنے سر کو حرکت دی) یہ متعدی اور غیر متعدی دونوں طرح آتا ہے، اسے اخفش نے بیان کیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: نغضت سنه یعنی اس کا دانت ہل گیا اور اکھڑ گیا۔ راجز نے کہا ہے:

ونغضت من هرم أسنانها(2)

(بڑھاپے کے سبب اس کے دانت ہل گئے) اور دوسرے نے کہا ہے:

لما رأتني انغضت لى الرأسا(3)

(جب اس نے مجھے دیکھا تو میرے لئے اپنا سر ہلا دیا)۔

اور ایک اور نے کہا ہے:

لا ماء فى المقراة إن لم تنهض بمسد فوق المحال النغض

المحال اور المحالة سے مراد وہ بڑی چرخی ہے جس کے ساتھ اونٹوں کو پانی پلایا جاتا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ یعنی وہ کہتے ہیں کہ دوبارہ زندہ کیا جانا، لوٹانا اور وہ وقت کب ہوگا۔ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا یعنی آپ فرمائیے وہ قریب ہے، کیونکہ عسى واجب کے معنی میں ہے؛ اس کی نظیر یہ ہے: وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا (الاحزاب) (اور (اے سائل!) تو کیا جانے شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔) اور لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ (الشوریٰ) (شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔) اور ہر وہ شے جو آنے والی ہو تو وہ قریب ہی ہوتی ہے۔

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

''اس دن کو یاد کرو جب تمہیں اللہ تعالیٰ بلائے گا سو تم اس کی حمد کرتے ہوئے جواب دو گے اور یہ گمان کر رہے ہو گے کہ تم نہیں ٹھہرے (دنیا میں) مگر تھوڑا عرصہ۔''

قولہ تعالیٰ: يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ، الدعا سے مراد میدان حشر کی طرف ایسے کلام کے ساتھ بلانا اور ندا دینا ہے جسے تمام مخلوق سنے گی، اس میں اللہ تعالیٰ انہیں (قبروں سے) نکلنے کے بارے ندا دے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 462 2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 116 3۔ ایضاً

سے مراد ایسی چیخ ہے جسے وہ سب سنیں گے، پس وہی ان کو قیامت کی زمین میں جمع ہونے کی دعوت ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک قیامت کے دن تمہیں اپنے ناموں اور اپنے باپوں کے ناموں سے بلایا جائے گا اس لئے اپنے نام خوبصورت رکھو(1)''۔ فَتَسْتَجِيبُوْنَ بِحَمْدِهٖ یعنی اس کے حمد کے مستحق ہونے کے سبب (تم اس کی حمد کرتے ہوئے جواب دو گے) اور ابو سہل نے کہا ہے: مراد الحمدللہ کہنا ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے

فإني بحمد الله لا ثوب فاجر لبستُ، ولا من غدرة أتقنع(2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد ہے: تم جواب دو گے اس حال میں کہ تم اپنی زبانوں سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کر رہے ہو گے (3)۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے: کفار اپنی قبروں سے نکلیں گے اور وہ کہہ رہے ہوں گے سبحانك و بحمدك لیکن اس دن کا اعتراف انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: بِحَمْدِهٖ سے مراد بامرہ (یعنی اس کے حکم سے) ہے، یعنی تم اقرار کرو گے کہ وہی تمہارا خالق ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس کی معرفت اور اس کی اطاعت کرتے ہوئے (4) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اس کی قدرت کے ساتھ۔ اور یہ قول بھی ہے: اس کے تمہیں بلانے کے ساتھ۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اور یہی صحیح ہے، کیونکہ صور میں پھونکنا ان کے قبروں سے نکلنے کا سبب ہوگا اور بالحقیقت یہ حق کی دعوت و پکار کے ساتھ مخلوق کا باہر نکلنا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيبُوْنَ بِحَمْدِهٖ پس وہ یہ کہتے ہوئے کھڑے ہوں گے سبحانك اللّٰھم و بحمدك۔ فرمایا: پس قیامت کا دن وہ دن ہے جس کا آغاز بھی حمد سے ہوگا اور اسی کے ساتھ اختتام ہوگا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيبُوْنَ بِحَمْدِهٖ اور اس کے آخر کے بارے میں فرمایا: وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الزمر) (اور فیصلہ کر دیا گیا ہوگا ان کے درمیان حق کے ساتھ اور کہا جائے گا سب تعریفیں اللہ کے لئے جو رب العالمین ہے۔)

وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا یعنی دو نفخوں کے درمیان (تم نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا عرصہ) اور یہ اس لئے ہوگا کہ دو نفخوں کے درمیان ان سے عذاب روک دیا جائے گا جنہیں پہلے عذاب دیا جا رہا تھا، اور وہ عرصہ چالیس برس ہوگا پس وہ سو جائیں گے اور اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰسین: 52) (کس نے ہمیں اٹھا کھڑا کیا ہے ہماری خوابگاہ سے؟) اور یہ کفار کے لئے خاص ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: قیامت کے دن سے پہلے کافروں کو ہلکی سی نیند آئے گی وہ اس میں نیند کا ذائقہ ہی پائیں گے، تو اچانک اہل قبور کے لئے چیخ ماری جائے گی تو وہ خوفزدہ، گھبرائے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ دنیا ان کی نگاہوں میں حقیر اور قلیل ہو جائے گی جس وقت وہ قیامت کے دن کو دیکھیں گے۔ حسن نے کہا ہے: وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا آخرت میں اپنے طویل ٹھہرنے کی وجہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء، جلد 2، صفحہ 320۔ ایضاً، باب فی تغییر الأسماء، حدیث نمبر 4297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 118

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 249

4۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 118

سے تم گمان کرو گے کہ دنیا میں تم نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا عرصہ (1)۔

وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۝۵۳

''اور آپ حکم دیجئے میرے بندوں کو کہ وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت عمدہ ہوں، بے شک شیطان فتنہ وفساد برپا کرنا چاہتا ہے ان کے درمیان، یقیناً شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اس کے اعراب اور ترکیب کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اور یہ آیت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور وہ اس طرح کہ آپ نے عرب (2) میں سے ایک آدمی کو خوب سب و شتم کیا اور اس کے قتل کا ارادہ کیا، قریب تھا کہ فتنہ بھڑک اٹھتا تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اسے ثعلبی، ماوردی، ابن عطیہ اور واحدی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مسلمانوں نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ان کے قتال کے بارے میں اجازت عطا فرمایئے تحقیق ان کی اذیت رسانی ہمارے لئے بڑھ گئی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے ابھی تک قتال کے بارے حکم نہیں دیا گیا ہے''۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ، یہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے آپ حکم دیجئے میرے ان بندوں کو جنہوں نے اعتراف کیا کہ میں ان کا خالق ہوں اور وہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں کہ وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت عمدہ ہوں کلمہ توحید میں سے اور اقرار نبوت میں سے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور حکم دیجئے میرے ایمان والے بندوں کو جب وہ توحید کے بارے میں کفار سے جھگڑا کریں، مباحثہ کریں، تو وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت ہی عمدہ ہوں، جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (الانعام: 108) (اور تم نہ برا بھلا کہو انہیں جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا (ایسا نہ ہو) کہ وہ بھی برا بھلا کہنے لگیں اللہ کو زیادتی کرتے ہوئے جہالت سے۔) اور حسن نے کہا ہے کہ وہ کافر کو کہے جب وہ زیادتی کرے: اللہ تعالیٰ تجھے ہدایت دے! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے! اور یہ انہیں جہاد کے بارے حکم دیئے جانے سے پہلے کی بات ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے آپ انہیں حکم دیجئے کہ وہ اس چیز کے بارے حکم دیں جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور وہ اس سے منع کریں جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، اس معنی کی بنا پر آیت مومن اور کافر کے بارے میں عام ہوگی، یعنی آپ تمام کو حکم دیجئے۔ واللہ اعلم۔

اور ایک گروہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنوں کو ان امور کے بارے میں حکم دیا ہے جو ان کے درمیان خاص ہیں، حسن ادب کے ساتھ اور قول کی نرمی کے ساتھ، پر جھکانے کے ساتھ اور شیطان کے فسادات کو پرے پھینکنے کے ساتھ، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی ہو جاؤ (3)''۔ یہ احسن قول ہے، یہ آیت محکم ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 249 2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 118

3۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، تحریم التحاسد والتباغض، جلد 2، صفحہ 315

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ بے شک شیطان ان کے درمیان فساد اور عداوت و گمراہی پھیلانا چاہتا ہے۔ سورۃ الاعراف اور سورۂ یوسف میں اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ کہا جاتا ہے نزغ بیننا شیطان نے ہمارے درمیان فساد برپا کیا؛ یزیدی نے یہ کہا ہے۔ اور کسی اور نے کہا ہے: النزغ کا معنی ہے الاغراء برانگیختہ کرنا، ابھارنا۔ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا بے شک شیطان انسان کا شدید عداوت کے سبب کھلا دشمن ہے۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ "ایک قوم بیٹھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے تھے پس شیطان آیا تاکہ ان کی مجلس کو ختم کر دے تو ملائکہ نے اسے روک دیا تو وہ ایک قوم کے پاس آیا جو قریب ہی بیٹھے تھے وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کر رہے تھے پس اس نے انہیں آپس میں اکسایا تو وہ آپس میں جھگڑ پڑے اور ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے تو ان ذکر کرنے والوں نے کہا: ہمارے ساتھ اٹھو ہم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیں، پس وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنی مجلس ختم کر دی اور اس سے شیطان خوش ہو گیا، پس یہ اس کی عداوت اور دشمنی میں سے ہے"۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ ۭ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ﴿۵۴﴾

"تمہارا رب تمہیں خوب جانتا ہے، اگر چاہے تو تم پر رحم (و کرم) فرما دے اور اگر چاہے تو تمہیں سزا دے، اور نہیں بھیجا ہم نے ان کو ان کا ذمہ دار بنا کر (تاکہ ان کے کفر کے لئے آپ جوابدہ ہوں)"۔

قولہ تعالیٰ: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْكُمْ یہ خطاب مشرکین کو ہے، اور اس کا معنی ہے: اگر وہ چاہے تو تمہیں اسلام کی توفیق عطا فرما دے اور تم پر رحم و کرم فرما دے، یا تمہیں شرک پر موت دے دے اور تمہیں سزا اور عذاب میں مبتلا کر دے؛ یہ ابن جریج نے کہا ہے۔ اور أعلم بمعنی علیم (خوب جاننے والا) ہے، جیسا کہ ان کا قول: اللہ اکبر میں اکبر بمعنی کبیر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب مومنین کے لئے ہے، یعنی اگر وہ چاہے تو تم پر رحم و کرم فرمائے اس طرح کہ وہ کفار مکہ سے تمہیں محفوظ رکھے، یا اگر وہ چاہے تو وہ تمہیں ان کو تم پر مسلط کر کے سزا دے؛ یہ کلبی نے کہا ہے۔ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا یعنی ہم نے آپ کو انہیں کفر سے روکنے کے بارے میں ذمہ دار نہیں بنایا اور نہ ہم نے ان کے ایمان کو آپ کے سپرد کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہم نے آپ کو ان کا کفیل نہیں بنایا کہ آپ کو ان کے بدلے پکڑ لیا جائے گا۔

اور شاعر نے کہا ہے:

ذکرت أبا أروی فبت کأننی ... برد الأمور الماضیات وکیل (1)

اس میں وکیل بمعنی کفیل ہے۔

وَ رَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۭ وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 250

اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

"اور آپ کا رب خوب جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور بے شک ہم نے بزرگی دی ہے بعض انبیاء کو بعض پر اور ہم نے عطا فرمائی ہے داؤد کو زبور۔"

قولہ تعالیٰ: وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ اس قول وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ کے بعد اس کا اعادہ کیا تا کہ وہ یہ واضح کردے کہ وہی ان کا خالق ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اخلاق، اشکال، احوال اور مال میں مختلف بنایا ہے؛ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (الملک: 14) (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے)۔ اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اسے ان کے اس حال کے بارے خوب علم ہے۔ اس بارے بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا زبور وہ کتاب ہے جس میں حلال وحرام میں سے کوئی نہیں ہے، اور نہ اس میں حدود و فرائض ہیں، بلکہ وہ تو فقط دعا اور تحمید و تمجید ہے، یعنی جس طرح ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی ہے پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن دیئے جانے کا انکار نہ کرو اور یہ یہودیوں کے جھگڑے اور اختلاف کے بارے میں ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾

"(انہیں) کہیے اب بلاؤ ان کو جنہیں تم گمان کیا کرتے تھے (کہ یہ خدا ہیں) اللہ تعالیٰ کے سوا، وہ تو قدرت نہیں رکھتے کہ تکلیف دور کر سکیں تم سے اور نہ ہی وہ (اسے) بدل سکتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ جب قریش کو قحط میں مبتلا کیا گیا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکوہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، یعنی تم ان کو بلاؤ جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش کرتے ہو اور یہ گمان کرتے ہو کہ وہ خدا ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے: یعنی ملائکہ، عیسیٰ اور عزیر (کو بلاؤ) (1)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ یعنی جنوں کو بلاؤ (2)۔ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ یعنی وہ قحط جو سات سال تک ان پر مسلط رہا (وہ اس تکلیف کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتے)، یہ مقاتل کے قول کے مطابق ہے۔ وَلَا تَحْوِيْلًا اور نہ ہی وہ اسے فقر سے غنیٰ (خوشحالی) کی طرف اور بیماری سے صحت کی طرف بدل سکتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾

"وہ لوگ جنہیں یہ مشرک پکارا کرتے ہیں، وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ کہ کون سا بندہ (اللہ تعالیٰ سے) زیادہ قریب ہے اور امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی اور ڈرتے رہتے ہیں اس کے عذاب سے بے شک آپ کے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔"

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 30　2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 250

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ مبتدا ہے۔ الَّذِيْنَ، اُولٰٓئِكَ کی صفت ہے۔ اور صلہ کی ضمیر محذوف ہے، یدعونھم یعنی وہ جنہیں پکارا جاتا ہے۔ اور يَبْتَغُوْنَ خبر ہے یا یہ حال ہوگا، اور الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ خبر ہے، ای یدعون إلیہ عبادا [أو عبادہ] إلی عبادتہ۔ (وہ اس کی طرف اس کے بندوں کو اس کی عبادت کے لئے پکارتے ہیں)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے تدعون صیغہ خطاب کی بنا پر تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے خبر کی بناء پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور يَبْتَغُوْنَ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ وہ یا کے ساتھ ہے۔ اور صحیح مسلم میں کتاب التفسیر میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قول باری تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ کے بارے کہا ہے: جنوں کے ایک گروہ نے اسلام قبول کرلیا حالانکہ ان کی عبادت کی جاتی تھی، پس وہ جو ان کی عبادت کرتے تھے ان کی عبادت اور پرستش پر باقی رہے حالانکہ جنوں کا ایک گروہ اسلام لا چکا تھا(1)۔ اور ایک روایت میں انہوں نے کہا: یہ آیت عربوں کے ایک گروہ کے بارے نازل ہوئی وہ جنوں کے گروہ کی عبادت کرتے تھے پس جنوں سے تعلق رکھنے والے تو اسلام لے آئے اور وہ انسان جو ان کی عبادت کرتے تھے وہ یہ شعور نہیں رکھتے تھے، پس یہ آیت نازل ہوئی(2): اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ، اور انہی سے یہ روایت بھی ہے کہ وہ ملائکہ ہیں عرب قبائل ان کی پرستش کرتے تھے: اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد نے کہا ہے کہ وہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام تھے۔ اور يَبْتَغُوْنَ کا معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے قریب اور نزدیکی کا ذریعہ تلاش کر رہے ہیں، اور جنت کی طلب میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور زاری کر رہے ہیں، اور یہی وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ کر دیا کہ ان کے معبود اپنے رب سے قرب اور نزدیکی تلاش کر رہے ہیں۔ اور رَبِّهِمُ میں ھا اور میم عبادت کرنے والوں کی طرف یا معبودوں کی طرف یا ان تمام کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اور رہا يَدْعُوْنَ تو اس کی ضمیر عبادت کرنے والوں کی طرف ہے۔ اور يَبْتَغُوْنَ کی ضمیر معبودوں کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ، يَبْتَغُوْنَ میں موجود ضمیر سے بدل ہو، اور اس کا معنی یہ ہو تلاش کرنا چاہئے کہ کون سا وسیلہ اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہے؟ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا بے شک آپ کے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے اس سے کسی کو کوئی امان نہیں، پس چاہیے کہ اس سے ڈرا جائے اور اس سے خوف کیا جائے۔ اور سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: امید اور خوف انسان پر دو زمانے ہیں، پس جب یہ دونوں برابر ہوں اس کے احوال صحیح اور درست ہوتے ہیں، اور اگر ان میں سے ایک ترجیح پا جائے تو دوسرا باطل ہو جاتا ہے(3)۔

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

"اور کوئی ایسی بستی نہیں ہے مگر ہم اسے برباد کریں گے روز قیامت سے پہلے یا اسے سخت عذاب دیں گے، یہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب التفسیر، فی قولہ تعالیٰ اولئك الذين يدعون، جلد 2، صفحہ 422
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 252

فیصلہ کتاب (تقدیر) میں لکھا ہوا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا اور کوئی ایسی بستی نہیں ہے مگر اسے خراب اور برباد کر دیں گے۔ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا مقاتل نے کہا ہے: اگر اس بستی کے رہنے والے نیک اور صالح لوگ ہیں تو موت کے ساتھ اس بستی کو ختم کر دیں گے، اور اگر وہ بدکار اور نافرمان ہیں تو پھر عذاب کے ساتھ اسے برباد کر دیں گے (1)۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: جب کسی بستی میں زنا اور سود عام ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان کی ہلاکت و بربادی کا اعلان فرما دیتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اور اگر وہ ظالموں کی بستی میں سے ہو۔ اور اسے یہ قول باری تعالیٰ تقویت دیتا ہے: وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰۤى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ (القصص) (اور نہیں ہیں ہم ہلاک کرنے والے بستیوں کو مگر یہ کہ ان کے بسنے والے ظالم ہیں۔) یعنی مشرکوں کو ڈرنا چاہیے، کیونکہ کافروں کی کوئی بستی نہیں ہے مگر اس میں عنقریب عذاب آئے گا۔ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ یعنی یہ فیصلہ کتاب یعنی لوح محفوظ میں ہے۔ مَسْطُوْرًا لکھا ہوا۔ اور "سطر" اس کا معنی لکھنا ہے اور یہ اصل میں مصدر ہے۔ اور السَّطَرُ طا متحرکہ کے ساتھ ہو تو بھی اسی طرح ہے۔

جریر نے کہا ہے:

من شاء بايعته مالى وخُلْعَتَهُ　　ما تُكْمِلِ التَّيْمُ فى ديوانهم سَطَرًا

الخُلعة خا کے ضمہ کے ساتھ اس کا معنی مال کا اختیار ہے۔ اور السَّطَرَ کی جمع أسطار ہے، جیسے سبب کی جمع اسباب ہے، پھر اس کی جمع الجمع اساطیر ہے۔ اور السطر کی جمع أسطر اور سطور ہے، جیسے أفلس اور فلوس ہیں۔ اور یہاں الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔

وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾

"اور نہیں روکا ہمیں اس امر سے کہ ہم بھیجیں (کفار کی تجویز کردہ) نشانیاں مگر اس بات نے کہ جھٹلایا تھا ان نشانیوں کو پہلوں نے (اور وہ فوراً تباہ کر دیئے گئے تھے) اور ہم نے دی تھی قوم ثمود کو ایک اونٹنی جو روشن نشانی تھی پس انہوں نے زیادتی کی اس پر، اور ہم نہیں بھیجتے ایسی نشانیاں مگر لوگوں کو (عذاب سے) خوفزدہ کرنے کے لئے۔"

قولہ تعالیٰ: وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ اس کلام میں حذف ہے، اور تقدیر کلام ہے: وما منعنا أن نرسل بالآيات التى إقترحوها إلا أن يكذبوا بها فيهلكوا كما فُعل بمن كان قبلهم (اور نہیں روکا ہمیں اس امر سے کہ ہم وہ نشانیاں بھیجیں جن کو کفار نے تجویز کیا مگر اس بات نے کہ وہ انہیں جھٹلائیں اور ہلاک کر دیئے جائیں جیسا کہ ان کے ساتھ کیا گیا جو ان سے پہلے تھے۔) اس کا یہ معنی قتادہ اور ابن جریج وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے کفار قریش سے عذاب کو مؤخر کر دیا کیونکہ اس کے علم میں تھا کہ ان میں وہ بھی ہیں جو ایمان لائیں گے اور ان میں وہ بھی ہیں جو مومنوں کو جنم

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 124

دیں گے۔ اس کا ذکر سورۃ الانعام وغیرہ میں گزر چکا ہے کہ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے صفا کو سونے میں بدل دے اور پہاڑ ان سے دور ہٹا دیئے جائیں، تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا: اگر آپ چاہیں تو وہی ہو جائے جو آپ کی قوم نے مانگا ہے لیکن اگر وہ ایمان نہ لائے تو پھر انہیں مہلت نہیں دی جائے گی اور اگر آپ چاہیں تو ان کے بارے انتظار کر لیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں، بلکہ میں ان کے بارے انتظار کروں گا۔“ اور پہلا اَنْ محل نصب میں ہے اس لئے کہ منع ان پر واقع ہوا، اور دوسرا اَنْ محل رفع میں ہے۔ اور بِالْاٰیٰتِ میں باء زائدہ ہے۔ اور مجاز کلام یہ ہے: و ما منعنا إرسال الآيات إلا تكذيب الأولين۔ (اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے نہیں روکا مگر پہلوں کے جھٹلانے نے) اور اللہ تعالیٰ کو کسی شے سے روکا نہیں جا سکتا، پس یہ اس معنی میں اظہار مبالغہ ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا، تو گویا اسے اس سے روک دیا گیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمائی جو کچھ اس نے ان کے ساتھ کیا جنہوں نے نشانیوں کا مطالبہ کیا اور وہ ان کے ساتھ ایمان نہ لائے، پس فرمایا: وَ اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً یعنی ہم نے قوم ثمود کو ایسی نشانی عطا فرمائی جو حضرت صالح علیہ السلام کی صداقت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر انتہائی واضح اور روشن دلیل تھی، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ فَظَلَمُوْا بِهَا یعنی انہوں نے اسے جھٹلانے کے ساتھ زیادتی کی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اس کا انکار کیا اور اسے تسلیم نہ کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے پس اللہ تعالیٰ نے عذاب کے ساتھ انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ وَ مَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا اس میں پانچ قول ہیں: (۱) وہ نصائح اور معجزات جو ڈرانے والے دلائل میں سے جھٹلانے والوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات کے ہاتھوں پر ظاہر فرمائے۔ (۲) کہ یہ گنہگاروں کو ڈرانے کے لئے انتقام کی علامات اور نشانیاں ہیں۔ (۳) یہ احوال کو بچپن سے جوانی کی طرف پھر بڑھاپے کی طرف اور پھر شیخوخت کی طرف پھیرنا اور بدلنا ہے، تاکہ تو اپنے احوال کے بدلنے سے عبرت حاصل کرے اور اپنے انجام سے ڈرنے لگے؛ اور یہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے(1)۔ (۴) اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ (۵) اس سے مراد جلدی اور تیزی سے آنے والی موت ہے) یہ قول حسن نے کہا ہے(2)۔

وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْۤ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝۶۰

”اور یاد کرو جب ہم نے کہا تھا آپ کو کہ بے شک آپ کے پروردگار نے گھیرے میں لے لیا ہے لوگوں کو، اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لئے نیز (آزمائش بنایا) اس درخت کو جس پر لعنت بھیجی گئی ہے قرآن میں، اور ہم انہیں (نافرمانی کے انجام سے) ڈراتے رہتے ہیں پس نہ بڑھایا اس ڈرانے نے انہیں مگر یہ کہ وہ زیادہ سرکشی کرنے لگے۔“

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہاں الناس سے مراد اہل مکہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 252　　2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 126

ہیں، اور اس کے انہیں گھیرنے سے مراد اس کا انہیں ہلاک کرنا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ عنقریب انہیں ہلاک کر دے گا۔ اور اس کو ماضی کے لفظ کے ساتھ ذکر کرنا اس کے تحقق اور وقوع کے یقینی ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور وہ ہلاک کرنا جس کا وعدہ کیا گیا ہے اس سے مراد وہ ہے جو کچھ یوم بدر اور یوم فتح کو ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَحَاطَ بِالنَّاسِ کا معنی ہے، یعنی اس کی قدرت نے ان کا احاطہ کیا ہوا ہے، پس وہ اس کے قبضے میں ہیں اور وہ اس کی مشیت سے نکلنے پر قدرت نہیں رکھتے؛ یہ حضرت مجاہد اور ابن ابی نجیح نے کہا ہے (1)۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے اس کے علم نے لوگوں کو گھیرا ہوا ہے (2)۔ اور یہ قول بھی ہے: کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں سے آپ کی حفاظت اور نگہبانی فرمائے گا کہ وہ آپ کو قتل کریں یہاں تک کہ آپ اپنے رب کا پیغام پہنچا دیں، یعنی ہم نے آپ کو ان پر نگران اور محافظ بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ آپ پر تبلیغ کرنے اور پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے، پس آپ اپنی محبت اور کوشش کے ساتھ تبلیغ کریں کیونکہ ہم آپ کو ان سے بچائیں گے اور ہم آپ کی حفاظت کریں گے، پس آپ ان سے نہ ڈریں اور وہ کام کریں تبلیغ رسالت میں سے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے، پس ہماری قدرت تمام کو محیط اور گھیرے ہوئے ہے؛ اس کا یہ معنی حضرت حسن، عروہ اور قتادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے (3)۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ جب یہ بیان کیا کہ قرآن کریم کی آیات کو نازل کرنا ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کو متضمن ہے تو اس کے ساتھ آیۃ الاسراء کا ذکر ملا دیا، اور وہ آیت اس سورت کے آغاز میں مذکور ہے۔ صحیح بخاری اور ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قول باری تعالیٰ: وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ کے تحت فرمایا: یہ آنکھ کے ساتھ دیکھا ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات دکھایا گیا جس رات آپ کو بیت المقدس کی طرف لے جایا گیا۔ فرمایا: وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ یہ زقوم (تھور) کا درخت ہے۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے (4): یہ حدیث صحیح ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی مثل ہی حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت معاویہ، حسن، مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر، ضحاک، ابن ابی نجیح اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے۔ اور فتنہ سے مراد قوم کا مرتد ہونا ہے جو اسلام لا چکے تھے (اور اس وقت مرتد ہو گئے) جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں خبر دی کہ انہیں معراج پر لے جایا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حالت نیند کی رؤیت ہے۔ اور یہ آیت اس قول کے فاسد ہونے کا تقاضا کرتی ہے، اور وہ اس لئے کہ حالت خواب میں دیکھنے میں کوئی فتنہ نہیں ہے، اور کوئی بھی نہیں ہے جو اس کا انکار کرے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس آیت میں جس رؤیا کا ذکر ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حدیبیہ کے سال میں یہ دیکھنا ہے کہ آپ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے، لیکن آپ کو واپس لوٹا دیا گیا پس مسلمان اس وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہو گئے، تب یہ آیت نازل ہوئی، پس جب آئندہ سال آیا تو آپ اس میں داخل ہوئے، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ (الفتح: 27) (یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ) اس تاویل میں ضعف ہے، کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور وہ نظارہ آپ نے مدینہ طیبہ میں دیکھا

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 253　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر من سورۂ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 141

تھا۔ اور تیسری روایت میں آپ نے کہا کہ آپ ﷺ نے خواب میں بنی مروان کو دیکھا کہ وہ آپ کے منبر پر بندروں کے کودنے کی طرح کود رہے ہیں، تو آپ کو یہ بہت برا لگا تو کہا گیا: بلاشبہ یہ دنیا ہے جو انہیں عطا کی گئی ہے، پس آپ سے فکر دور کر دی گئی، اور آپ کا مکہ مکرمہ میں کوئی منبر نہ تھا لیکن یہ جائز ہے کہ آپ نے مکہ مکرمہ میں مدینہ منورہ والے منبر کا نظارہ دیکھا ہو۔ اور یہ تیسری تاویل حضرت سہل بن سعد نے بھی بیان کی ہے۔ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: بے شک یہی نظارہ وہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی امیہ کو اپنے منبر پر بندروں کے کودنے کی طرح کودتے دیکھا، تو آپ اس سے غمزدہ ہو گئے، اور اس دن سے آپ کھل کر ہنسے نہیں یہاں تک کہ آپ ﷺ کا وصال ہو گیا، پس یہ آیت اس کی خبر دینے کے لئے نازل ہوئی کہ ان کی بادشاہی اور ان کے غالب آنے کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے فتنہ (آزمائش) اور امتحان بنا دے گا (1)۔ اور امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اپنی بیعت کے بارے میں اپنے خطبہ میں یہ پڑھا: وَاِنْ اَدْرِیْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ۝ (الانبیاء) (اور میں کیا جانوں (اس ڈھیل سے) شاید تمہارا امتحان لینا اور ایک وقت تک تمہیں لطف اندوز کرنا مطلوب ہو) ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ تاویل محل نظر ہے۔ اور اس رؤیا میں حضرت عثمان، حضرت عمر بن عبدالعزیز، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم داخل نہیں ہیں۔ قولہ تعالیٰ: وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی ما جعلنا الرؤیا ألتی أریناك والشجرة الملعونة فی القرآن إلا فتنة للناس۔ (ہم اس نظارہ کو جو ہم نے آپ کو دکھایا اور اس درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے نہیں بنایا مگر لوگوں کے لئے آزمائش) اور اس کا فتنہ یہ تھا کہ انہیں جب اس کے ساتھ خوفزدہ کیا گیا تو ابو جہل نے استہزا کیا: یہ محمد (ﷺ) ہیں تمہیں ایسی آگ سے ڈرا رہے ہیں جو پتھروں کو جلاتی ہے، پھر یہ گمان کرتے ہیں کہ درختوں کو اگاتی ہے حالانکہ آگ درختوں کو کھاتی ہے، اور ہم زقوم کو نہیں پہچانتے مگر یہ کہ وہ کھجور اور مکھن ہے، پھر ابو جہل نے اپنی لونڈی کو حکم دیا پس وہ کھجور اور مکھن لے آئی اور اس نے اپنے ساتھیوں کو کہا: تزقموا زقوم کھاؤ (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہ قول کہ ہم زقوم کو نہیں جانتے مگر کھجور اور مکھن، کہنے والا ابن زبعری ہے جس وقت اس نے کہا: کثر اللہ من الزقوم فی دارکم (اللہ تعالیٰ تمہارے گھر میں زقوم زیادہ کرے)، کیونکہ لغت یمن میں اس سے مراد مکھن اور کھجور ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں نے اس طرح کہا ہو۔ پس بعض ضعیف اور کمزور لوگ اس قول کی وجہ سے بھی آزمائش اور فتنہ میں پڑ گئے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو خبر دی ہے کہ بے شک واقعہ معراج اور زقوم کے درخت کے ذکر کو آزمائش اور امتحان بنا دیا گیا ہے تا کہ وہ کافر ہو جائے جس پر کفر سبقت لے گیا ہے اور وہ تصدیق کرلے جس کے لئے ایمان سبقت لے گیا ہے۔ (یعنی جو اللہ تعالیٰ کے علم میں کافر ہے وہ انکار کر دے اور جو مومن ہے وہ تصدیق کر دے۔) جیسا کہ روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو معراج کی صبح کہا گیا: بے شک آپ کا ساتھی کہہ رہا ہے کہ وہ گزشتہ رات بیت المقدس میں سے ہو آیا ہے! تو آپ نے فرمایا: ان کان قال ذالك فقد صدق اگر آپ نے یہ فرمایا ہے تو یقیناً سچ فرمایا ہے۔ تو آپ کو کہا گیا: کیا آپ ان کی تصدیق کر رہے ہیں اس سے پہلے کہ آپ ان سے سنیں؟ تو انہوں نے فرمایا: تمہاری عقلیں کہاں ہیں؟ میں آسمان

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 468 2۔ ایضاً

کی خبر کے بارے ان کی تصدیق کرتا ہوں، تو میں بیت المقدس کی خبر کے بارے کیسے ان کی تصدیق نہیں کروں گا، حالانکہ آسمان اس سے بہت زیادہ دور ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ خبر ابن اسحاق نے ذکر کی ہے، اور انہوں نے بیان کیا ہے: فرمایا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج کے بارے میں جو حدیث مجھ تک پہنچی ہے وہ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابو سعید خدری، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت معاویہ بن ابی سفیان، حسن بن ابی الحسن، ابن شہاب زہری اور قتادہ رضی اللہ عنہم ان کے علاوہ دیگر اہل علم اور حضرت ام ہانی بنت ابی طالب سے مروی ہے، جو کچھ اس حدیث میں جمع ہے، ہر کوئی ان بعض امور کو بیان کرتا ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ اسراء کے وقت بیان کئے گئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر اسراء میں اور جو کچھ اس بارے میں ذکر کیا گیا ہے اس میں آزمائش، امتحان اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی سلطنت سے متعلقہ امور میں سے کئی امور ہیں، اس میں صاحب عقل لوگوں کے لئے سامان عبرت ہے، اور ان کے لئے ہدایت، رحمت اور ثبات ہے جو ایمان لائے اور تصدیق کی۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ امر تو یقینی ہے کہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیر کرائی جیسے چاہی اور جہاں تک چاہی تا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وہ نشانیاں دکھائے جن کا اس نے ارادہ کیا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے امر، اس کی عظیم سلطنت اور اس کی وہ قدرت جس کے ساتھ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے کا معائنہ اور مشاہدہ کیا۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس روایت میں جو ان سے مجھ تک پہنچی ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس براق لایا گیا ...... اور یہ وہ جانور ہے جس پر آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کو اٹھایا جاتا رہا وہ اپنا قدم اپنی حد نگاہ پر رکھتا ہے ...... پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر سوار کیا گیا، پھر اس کا صاحب (لانے والا) اسے لے کر نکلا آپ آسمان و زمین میں موجود علامات اور آیات دیکھتے رہے، یہاں تک کہ آپ بیت المقدس تک پہنچ گئے، تو اس میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو گروہ انبیاء میں دیکھا وہ آپ کے لئے جمع کئے گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز پڑھائی پھر آپ کے پاس تین برتن لائے گئے: ایک برتن میں دودھ تھا، ایک برتن میں شراب تھی، اور ایک برتن میں پانی تھا۔ انہوں نے بیان کیا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سو میں نے کسی کہنے والے کو یہ کہتے ہوئے سنا جس وقت وہ مجھ پر پیش کئے گئے کہ اگر انہوں نے پانی لیا تو غرق ہو جائیں گے اور ان کی امت بھی غرق ہو جائے گی، اور اگر انہوں نے شراب پکڑی تو گمراہ ہو جائیں گے اور ان کی امت بھی گمراہ ہو جائے گی، اور اگر انہوں نے دودھ لیا تو خود بھی ہدایت پا جائیں گے اور ان کی امت بھی ہدایت پا جائے گی''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''پس میں نے دودھ والا برتن پکڑا اور پی لیا تو جبرائیل امین نے مجھے کہا: ''اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی راہنمائی کر دی گئی اور آپ کی امت کی بھی راہنمائی کر دی گئی۔''

ابن اسحاق نے کہا ہے: میں نے حسن سے حدیث نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس اثنا میں کہ میں حجرے میں سو رہا تھا میرے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور انہوں نے اپنے پاؤں کے ساتھ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 468

مجھے دبایا تو میں بیٹھ گیا لیکن میں نے کوئی شے نہ دیکھی پھر میں اپنے بستر کی طرف لوٹ گیا پھر وہ دوسری بار میرے پاس آئے اور انہوں نے اپنے پاؤں کے ساتھ مجھے دبایا تو میں بیٹھ گیا لیکن میں نے کوئی شے نہ دیکھی پھر میں اپنے بستر کی طرف لوٹ گیا۔ پھر وہ تیسری بار میری طرف آئے اور اپنے قدموں کے ساتھ مجھے دبایا تو میں بیٹھ گیا اور انہوں نے میرا بازو پکڑ لیا اور میں ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور وہ مسجد کے دروازے کی طرف نکل گئے وہاں سفید رنگ کا جانور تھا جو (قد میں) خچر اور گدھے کے درمیان تھا اس کی رانوں پر دو پر تھے وہ انہیں اپنی ٹانگوں پر مارتا تھا اور اپنا قدم اپنی انتہائے نگاہ پر رکھتا تھا پس انہوں نے مجھے اس پر سوار کر دیا پھر میرے ساتھ نکل پڑے پھر نہ وہ مجھ سے الگ ہوئے اور نہ میں ان سے الگ ہوا۔" ابن اسحاق نے بیان کیا ہے اور مجھے حضرت قتادہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا، مجھے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جب میں اس کے قریب ہوا کہ میں اس پر سوار ہوں تو وہ اچھلنے اور بدکنے لگا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اس کی کلغی والی جگہ پر رکھا اور فرمایا: اے براق! کیا تو اس سے حیا نہیں کرتا جو تو کر رہا ہے؟ قسم بخدا! حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ تجھ پر سوار نہیں ہوا جو ان سے زیادہ معزز و مکرم ہو، فرمایا: پس اسے حیاء آ گئی یہاں تک کہ پسینہ بہنے لگا پھر وہ پر سکون ٹھہر گیا اور میں اس پر سوار ہو گیا۔"

حسن نے اپنی حدیث میں کہا ہے: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چلے اور ان کے ساتھ جبرائیل امین بھی چلتے رہے یہاں تک کہ آپ بیت المقدس پہنچ گئے، پس وہاں آپ نے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو گروہ انبیاء علیہم السلام میں پایا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی امامت کرائی اور انہیں نماز پڑھائی پھر آپ کے پاس دو برتن لائے گئے: ان میں سے ایک میں شراب تھی اور دوسرے میں دودھ تھا، فرمایا: پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا برتن پکڑ لیا اور اس سے پی لیا اور شراب کا برتن چھوڑ دیا۔ راوی نے کہا: تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو کہا: آپ کی راہنمائی فطرت کی طرف کر دی گئی اور آپ کی امت کو ہدایت دے دی گئی اور تم پر شراب حرام کر دی گئی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ کی طرف واپس لوٹ کر آئے، پس جب صبح کی اور قریش کی ملاقات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں واقعہ کی خبر دی، تو اکثر لوگوں نے کہا: قسم بخدا! یہ معاملہ تو بین اور واضح ہے؟ قسم بخدا! بے شک ایک قافلہ مکہ سے شام کی طرف مسلسل ایک مہینہ چلتا ہے ایک مہینہ جاتے ہوئے اور ایک مہینہ واپس آتے ہوئے، اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں ایک رات میں جاتے ہیں اور مکہ کی طرف واپس بھی لوٹ آتے ہیں! راوی نے بیان کیا: پس بہت سے وہ لوگ مرتد ہو گئے جو ابھی اسلام لائے تھے اور لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف گئے: اے ابا بکر! کیا تجھے اپنے ساتھی کے بارے خبر ہے؟ اس کا خیال ہے کہ وہ اس رات بیت المقدس آیا، اور اس میں نماز پڑھی اور واپس مکہ لوٹ آیا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بے شک تم ان کے بارے میں جھوٹ بول رہے ہو، تو انہوں نے کہا: نہیں، بلکہ وہ وہاں مسجد میں بیٹھے لوگوں سے بیان کر رہا ہے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قسم بخدا! اگر انہوں نے یہ کہا ہے تو یقیناً وہ سچ ہے اس میں سے کون سی شے تمہیں تعجب میں ڈال رہی ہے؟ قسم بخدا! بلاشبہ وہ مجھے خبر دیتے ہیں کہ یہ خبر آسمان سے زمین کی طرف رات یا دن کی ایک ساعت میں آتی ہے تو میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، تو یہ

اس سے بہت بعید اور دور ہے جس سے تم تعجب کر رہے ہو۔ پھر آپ آئے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے اور عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، کیا آپ نے انہیں یہ بیان کیا ہے کہ آپ اس رات بیت المقدس تشریف لے گئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' آپ نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس کے بارے مجھے بیان فرمائیے، کیونکہ میں نے اسے دیکھا ہوا ہے پس حسن نے بیان کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسے میرے لئے اٹھایا گیا یہاں تک کہ میں اسے دیکھنے لگا۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے اس کی ہیئت بیان فرمانے لگے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: آپ نے سچ فرمایا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں جب بھی آپ اس میں سے کوئی شے بیان فرماتے تو یہ کہتے: صدقت، أشهد أنك رسول الله (آپ نے سچ فرمایا ہے، میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔) راوی نے بیان کیا: یہاں تک کہ جب بات مکمل ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو فرمایا: وأنت یا ابابکر الصدیق (اے ابا بکر تو تو صدیق ہے) پس اس دن آپ نے آپ کا نام صدیق رکھ دیا۔ حسن نے بیان کیا ہے: اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے یہ آیت نازل فرمائی جو اس وجہ سے اسلام سے مرتد ہو گئے: وَ مَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْۤ اَرَیْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ ؕ وَ نُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا طُغْیَانًا كَبِیْرًا ۝ ۔(1)

پس یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ اسراء کے بارے حسن کی حدیث ہے اور کچھ اس میں حضرت قتادہ کی حدیث سے بھی داخل ہے، اور ان سے باقی واقعہ معراج کا ذکر کتب میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ درخت بنو امیہ ہیں، اور یہ کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کو شہر بدر کر دیا۔ یہ قول ضعیف اور من گھڑت ہے اور یہ سورت مکی ہے، اور یہ تاویل بعید ہے، مگر اس صورت میں کہ یہ آیت مدنی ہو، لیکن یہ ثابت نہیں۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مروان کو کہا تھا: اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ پر لعنت کی ہے اور تو اس کی صلب میں تھا پس تو بھی اللہ تعالیٰ کی لعنت کا بعض اور جز ہے۔ پھر فرمایا: وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ اور قرآن میں اس درخت پر لعنت جائز نہیں، لیکن (اس طرح کہ) اللہ تعالیٰ نے کفار پر لعنت کی ہے اور وہ اسے کھانے والے ہیں۔ اور اس کا معنی ہے: والشجرة الملعونة فی القرآن آکلوها۔ (اور وہ درخت جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے وہ اسے کھانے والے ہیں۔) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عربوں کے اس قول کی بنا پر ہو کہ وہ ہر ناپسندیدہ اور نقصان دہ کھانے کے لئے کہتے ہیں: ملعون (اس پر لعنت کی گئی ہے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الشجرة الملعونه سے مراد وہی درخت ہے جو درختوں پر لپٹ جاتا ہے اور انہیں مار دیتا ہے (یعنی خشک کر دیتا ہے) مراد الکشوث ہے (2) (یعنی ایک قسم کی گھاس ہے جو کانٹوں اور درختوں پر لپٹی ہوتی ہے نہ اس کی جڑ ہوتی ہے نہ اس کے پتے ہوتے ہیں۔ المنجد) وَ نُخَوِّفُهُمْ اور ہم انہیں زقوم (تھور) کے ساتھ ڈراتے ہیں۔ فَمَا یَزِیْدُهُمْ اور یہ ڈرانا سوائے کفر کے ان میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 34-33 2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 132

خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿٦١﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٦٢﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے کہا: کیا میں جدہ کروں اس (آدم) کو جس کو تو نے کیچڑ سے پیدا کیا۔ اس نے کہا: مجھے بتا یہ (آدم) جس کو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے (اس کی وجہ کیا ہے)؟ اگر تو مجھے مہلت دے روز قیامت تک تو جڑ سے اکھیڑ پھینکوں گا اس کی اولاد کو سوائے چند افراد کے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ شیطان کے انسان کا دشمن ہونے کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، پس کلام کو ذکر آدم کی طرف متوجہ کیا۔ اور اس کا معنی ہے: ان مشرکین کی سرکشی اور اپنے رب کے بارے میں ان کی رعونت کے ساتھ ابلیس کے قصہ کو یاد کرو جس وقت اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی تھی اور سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا، اور وہ کہا جو کہا، اور وہ وہ ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں دی ہے: فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا یعنی کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تو نے کیچڑ سے پیدا کیا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے بحث سورۃ البقرہ اور الانعام میں مکمل طور پر گزر چکی ہے۔ قَالَ اَرَءَيْتَكَ یعنی یہ ابلیس نے کہا۔ اور اس میں کاف خطاب کی تاکید کے لئے ہے۔ (اس نے کہا: مجھے بتا) هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ یعنی یہ آدم ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے۔ اس نے آگ کے جوہر کو کیچڑ اور مٹی کے جوہر سے بہتر دیکھا اور اسے یہ علم نہ ہوا کہ جواہر متماثل اور برابر ہیں۔ یہ اعراف میں گزر چکا ہے۔ اور ھذا، ارأیت کے سبب منصوب ہے۔ اور الذی اس کی صفت ہے۔ اور الاکرام ایسا اسم ہے جو ہر اس شے کو جامع ہے جس کی تعریف کی جارہی ہو۔ اور کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت یہ ہے: أخبرنی عن هذا الذی فضلته علیّ (مجھے اس کے بارے خبر دے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے)، تو نے اسے کیوں فضیلت دی ہے حالانکہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اسے تو نے کیچڑ سے پیدا کیا ہے؟ سامع کو علم ہونے کی وجہ سے کلام کو حذف کر دیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تقدیر حذف کی کوئی حاجت نہیں، یعنی مجھے بتا تو سہی کیا تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی ہے میں ضرور اس کے ساتھ اس اس طرح کروں گا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق لَاَحْتَنِكَنَّ کا معنی ہے: میں ان پر غالب آ جاؤں گا۔ اور یہ فراء نے بھی کہا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: میں ضرور انہیں جمع کر لوں گا۔ ابن زید نے کہا ہے: اس کا معنی ہے میں انہیں گمراہ کروں گا۔ اور اس کا معنی قریب قریب ہے، یعنی میں اس کی اولاد کو بھٹکانے اور گمراہ کرنے کے سبب جڑ سے اکھیڑ دوں گا، اور ضرور انہیں ہلاک و برباد کر دوں گا۔ اور عربوں سے مروی ہے: احتنك الجراد الزرع جب ٹڈی دل (مکڑی) ساری کھیتی کو تباہ کر دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے میں انہیں ضرور چلاؤں گا جہاں میں چاہوں گا اور میں انہیں ادھر ہی کھینچوں گا جہاں کا میں نے ارادہ کیا۔ یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: حنکت الفرس أحنکه وأحنکه حنکا جب تو گھوڑے کے منہ میں رسی ڈال لے اور اسی طرح احتنکه بھی ہے اور پہلا قول اس کے قریب ہے، کیونکہ وہ کھیتی پر تباہی و بربادی لاتا ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

أشكوا إليك سنةً قد أجحفت جهداً إلى جهدٍ بنا وأضعفت

واحتنكت أموالنا واجتلفت (1)

اس میں احتنك ہلاک اور برباد کرنے کے معنی میں ہی ہے۔

اِلَّا قَلِیۡلًا مراد وہ ہیں جو محفوظ اور بچے ہوئے ہیں، اور وہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے: اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ (الحجر:42) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔) ابلیس نے یہ ظناً کہا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَقَدۡ صَدَّقَ عَلَیۡہِمۡ اِبۡلِیۡسُ ظَنَّہٗ (السبا:20) (اور بے شک سچ کر دکھایا ان (ناشکروں) پر شیطان نے اپنا گمان) یا اس نے انسان کی طبع اور مزاج کو جان لیا کہ ان میں شہوت رکھی ہوئی ہے، یا اس نے ملائکہ کے اس قول پر بنیاد رکھی: اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا (البقرہ:30) (کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں)۔ اور حسن نے کہا ہے: یہ اس کا ظن اور گمان ہے کیونکہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام میں وسوسہ اندازی کی اور اس نے انہیں پختہ عزم نہ پایا۔

قَالَ اذۡہَبۡ فَمَنۡ تَبِعَکَ مِنۡہُمۡ فَاِنَّ جَہَنَّمَ جَزَآؤُکُمۡ جَزَآءً مَّوۡفُوۡرًا ﴿۶۳﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جا چلا جا (جو مرضی ہو کر) سو جو تیری پیروی کرے گا ان سے تو بے شک جہنم ہی تم سب کی پوری پوری سزا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: قَالَ اذۡہَبۡ یہ برائے اہانت (وحقارت) ہے، یعنی تو اپنی پوری کوشش کر لے تحقیق ہم تجھے دیکھ لیں گے۔ فَمَنۡ تَبِعَکَ یعنی اولاد آدم میں سے جس نے تیری اطاعت و پیروی کی۔ فَاِنَّ جَہَنَّمَ جَزَآؤُکُمۡ جَزَآءً مَّوۡفُوۡرًا تو بے شک جہنم تم سب کی پوری اور وافر سزا ہے۔ یہ معنی حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے، کہا جاتا ہے: وفرته أفره وفرا (میں نے اسے پورا کر دیا)، اور وفر المال بنفسه يفر وفورا فهو وافر (مال خود بخود پورا ہو گیا)، پس یہ لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔

وَ اسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡہُمۡ بِصَوۡتِکَ وَ اَجۡلِبۡ عَلَیۡہِمۡ بِخَیۡلِکَ وَ رَجِلِکَ وَ شَارِکۡہُمۡ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ وَ عِدۡہُمۡ ؕ وَ مَا یَعِدُہُمُ الشَّیۡطٰنُ اِلَّا غُرُوۡرًا ﴿۶۴﴾

"اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کر سکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی فسوں کاری) سے اور دھاوا بول دے ان پر اپنے گھوڑ سواروں اور پیادہ دستوں کے ساتھ اور شریک ہو جا ان کے مالوں میں اور اولاد میں اور ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا رہ، اور وعدہ نہیں کرتا ان سے شیطان مگر مکر و فریب کا۔"

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 135

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاسْتَفْزِزْ یعنی تو پھسلا اور دور ہٹا اور اس کا اصل معنی القطع (کاٹنا) ہے۔ اور اسی سے ہے تفززّ الثوبُ جب کپڑا کٹ جائے، اور اس کا معنی ہے تو اسے حق سے کاٹ کر (یعنی گمراہ کر کے) اسے پھسلا دے۔ اور استفزّہ الخوفُ یعنی خوف نے اسے ہلکا کر دیا، دور ہٹا دیا اور قعد مُسْتَوفِزًا یعنی وہ غیر مطمئن بیٹھا۔ وَاسْتَفْزِزْ یہ امر برائے تعجیز (عاجز کرنے کے لئے) ہے، یعنی تو کسی کو گمراہ کرنے پر قادر نہیں ہو سکتا، اور نہ تجھے کسی پر کوئی غلبہ ہو سکتا ہے پس تو جو چاہے کر لے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: بِصَوْتِكَ اور اس کی آواز ہر وہ داعی ہے جو اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی کی طرف بلاتا ہے، دعوت دیتا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے (1)۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: گیت، بانسری، اور لہو (ولہب) ہے (2)۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بانسری کی آواز مراد ہے (3)۔ اور حضرت آدم علیہ السلام نے ہابیل کی اولاد کو پہاڑ کی چوٹی پر سکونت دی، اور قابیل کی اولاد کو اس کے نیچے رکھا، اور ان میں حسین و جمیل بیٹیاں تھیں، پس شیطان لعین نے بانسری بجائی اور وہ نیچے اترنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکے پس انہوں نے بدکاری کی؛ اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بِصَوْتِكَ سے مراد ہے تو اپنے وسوسہ کے ساتھ۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَاَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَرَجِلِكَ، الاجلاب کا اصل معنی ہے السوق بجلبة من السائق (ہانکنے والے کا کسی چیز کو سختی سے ہانک کر لے آنا)، کہا جاتا ہے: أجلب إجلاباً (وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھا) اور الجَلَب اور الجَلَبة کا معنی آوازیں (شور وشغب) ہے۔ تو اسی سے کہتا ہے: جَلَّبُوْا (یعنی تشدید کے ساتھ) انہوں نے شور مچایا۔ اور جَلَبَ الشئ یجلِبه و یجلُبه جَلَبًا و جَلْبًا (اس نے شے کو ہانکا) اور جلبت الشئ إلی نفسی اور اجتلبته دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور أجلب علی العدو إجلاباً یعنی اس نے دشمن پر دھاوا بول دیا (یکبارگی حملہ کر دیا)۔ پس آیت کا معنی یہ ہوا تو ان پر دھاوا بول دے جب بھی تو اس پر اپنے مکر و فریب سے قدرت رکھے۔ اور اکثر مفسرین نے کہا ہے: مراد اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں ہر گھوڑ سوار اور پیدل چلنے والا ہے۔ اور حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: بے شک جنوں اور انسانوں میں سے اس کے گھوڑ سوار اور پیدل (دستے) ہیں، پس جو بھی گھوڑ سوار اور پیدل چلنے والا اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں قتال کرتا ہے تو وہی ابلیس کے گھوڑ سوار اور پیدل دستے ہیں (4)، اور حضرت سعید بن جبیر اور حضرت مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہر وہ گھوڑا جو اللہ تعالیٰ کی معصیت میں چلا، اور ہر وہ پاؤں جو اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی میں چلا، اور ہر وہ مال جو حرام سے حاصل کیا گیا، اور ہر وہ بچہ جو بدکار اور باغی ہو تو وہ شیطان کے لئے ہے۔ اور الرَّجْل راجل کی جمع ہے (پیدل) جیسا کہ صَحْب صاحب کی جمع ہے۔ اور حفص نے وَرَجِلِكَ جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں، کہا جاتا ہے: رَجُل و رَجِل بمعنی راجل (پیدل چلنے والا)۔ اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 136
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 255
3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 137

حضرت عکرمہ اور قتادہ نے ورجالک صیغہ جمع کے ساتھ قرأت کی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ یعنی تو اپنے آپ کو ان میں شریک بنا لے، پس اموال میں اس کی شرکت انہیں اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی میں خرچ کرنا ہے؛ یہ حسن نے کہا ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ شرکت وہ ہے جس کے سبب وہ مالوں کو غیر حلال تک پہنچا دیں؛ یہ حضرت مجاہد نے کہا ہے (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: یہ وہ ہے جو وہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام جانوروں کو حرام قرار دیتے ہیں (3)۔ اور یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ وہ جانور مراد ہیں جنہیں وہ اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ اور اولاد میں شرکت کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ مراد زنا سے پیدا ہونے والی اولاد ہے؛ یہ حضرت مجاہد، ضحاک اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور انہی سے یہ بھی ہے: مراد وہ ہے جو انہوں نے اپنے بچوں میں سے قتل کئے اور ان میں جرائم پیدا کر دیئے۔ اور اس کے بارے میں یہ بھی ہے کہ اس سے مراد ان کا عبدالحارث، عبدالعزیٰ، عبداللات اور عبدشمس وغیرہ نام رکھنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کا اپنے بچوں کو کفر میں رنگنا ہے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں یہودی بنا دیا اور انہیں عیسائی بنا دیا جیسا کہ عیسائی اپنے بچوں کو اس پانی میں ڈبونے کا عمل کرتے تھے جو ان کے لئے تیار کرتے؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور پانچواں قول ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے انہوں نے کہا: جب آدمی جماع کرے اور بسم اللہ نہ پڑھے تو جن (شیطان) اس کے حشفہ کے ساتھ لپٹ جاتا ہے اور وہ بھی اس کے ساتھ جماع کرتا ہے، اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۝ (الرحمٰن) (جن کو نہ کسی انسان نے چھوا ہو گا ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے)۔ اس کا بیان آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک تم میں مغربین ہیں''۔ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مغربون کون ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ لوگ جن میں جن شریک ہو جاتے ہیں'' (4)۔ اسے حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں روایت کیا ہے۔ ہروی نے کہا ہے: پس جنوں کے انسانوں کے ساتھ بعض امور اور میل جول میں مفاخر ہوتے ہیں پس ان میں سے بعض کی ان میں شادی ہوتی ہے، اور سب کی ملکہ بلقیس کے والدین میں سے ایک جنوں میں سے تھا۔ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَعِدْهُمْ یعنی انہیں جھوٹی امیدیں دلا، اور یہ کہ کوئی قیامت نہیں اور نہ کوئی حساب ہے، اور یہ کہ اگر حساب، جنت اور جہنم ہوئے بھی تو بھی دوسروں کی نسبت تم جنت کے زیادہ مستحق اور اہل ہو۔ اس معنی کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مزید قوت دیتا ہے: يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۝ (النساء) (شیطان (جھوٹے) وعدے کرتا ہے ان سے اور (غلط) امیدیں دلاتا ہے انہیں اور نہیں وعدہ کرتا شیطان مگر فریب کا) یعنی شیطان ان سے صرف باطل وعدہ کرتا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: وَعِدْهُمْ یعنی تو ان کی مدد و نصرت کا وعدہ کر ہر اس کے خلاف جو ان کے بارے میں برائی کا ارادہ کرے۔ اور یہ امر شیطان کے لئے جھڑک اور سخت وعید ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اسے اور اس کی اتباع کرنے والوں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 255 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 354، حدیث 44900

کو حقیر اور ہلاک سمجھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ اس آیت میں وہ بھی ہے جو بانسری، گیت، گانے اور لہو (ولہب) کے حرام ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ہے۔ اور ہر وہ جو شیطان کی آواز یا اس کے فعل سے ہو اور وہ چیز جسے وہ اچھا سمجھتا ہو اس سے بچنا واجب ہے۔ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے بانسری کی آواز سنی تو اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں رکھ لیں اور راستے سے اپنی سواری کو پھیر لیا اور یہ کہنے لگے: اے نافع! کیا تو سن رہا ہے؟ تو میں نے کہا: ہاں، پس آپ چلتے رہے یہاں تک کہ میں نے کہا: نہیں، پس اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور اپنی سواری کو اپنے راستے پر لوٹا دیا۔ اور فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ نے ایک چرواہے کی بانسری کی آواز سنی تو آپ نے بھی اسی طرح کیا (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: جب اس آواز کے حق میں ان کا فعل اور عمل یہ ہے جو اعتدال سے نہیں نکلتی، تو پھر اس زمانے کے باسیوں کے گانے اور ان کی بانسری بجانے کے بارے کیفیت اور حالت کیا ہوگی؟ اس کا مزید بیان سورۂ لقمان میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا ۝۶۵

"جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا، اور (اے محبوب!) کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کی کارسازی کے لئے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ مومنین ہیں۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا یعنی تیرا رب قبول کر کے ابلیس سے بچانے کے لئے، اس کے فریب اور اس کے مکر کی برائی سے حفاظت کرنے کے لئے کافی ہے۔

رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا ۝۶۶

"تمہارا رب وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے لئے کشتیوں کو سمندر میں تاکہ تم تلاش کرو (بحری سفر کے ذریعہ) اس کا فضل، بے شک وہ تمہارے ساتھ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔"

قولہ تعالیٰ: رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ، الازجاء کا معنی "چلانا" ہے۔ اور اسی سے یہ قول باری تعالیٰ بھی ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا (النور: 43) (کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ لے جاتا ہے بادل کو)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

یأیھا الراکب المزجی مطیّتہ	سائل بنی أسد ما ھذہ الصّوتُ (2)

تو اس میں بھی مزجی چلانے والے کے معنی میں ہے۔

اور ازجاء الفلک کا معنی ہے کشتیوں کو نرم ہوا کے ساتھ چلانا۔ اور الفلک یہاں جمع ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، باب کراہیۃ الغناء الخ، حدیث نمبر 4278، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 256

البحر سے مراد کثیر پانی ہے چاہے وہ میٹھا ہو یا نمکین ہو، اور یہ اسم مشہور معنی پر غالب ہے۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے بندوں پر اس کے فضل و کرم کے بارے واقفیت دلاتی ہے، یعنی تمہارا رب وہ ہے جس نے تم پر اس اس طرح کی نعمتیں فرمائی ہیں پس تم اس کے ساتھ کسی شی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ تاکہ تم تجارت میں اس کا فضل تلاش کرو۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا۔

وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۝۶۷

''اور جب پہنچتی ہے تمہیں تکلیف سمندر میں تو گم ہو جاتے ہیں وہ (معبود) جن کو تم پکارا کرتے ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے، پس جب وہ خیر و عافیت سے تمہیں ساحل پر پہنچا دیتا ہے (تو) تم روگردانی کرنے لگتے ہو اور انسان (واقعی) بڑا ناشکرا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِی الْبَحْرِ، والضُّرُّ کا لفظ غرق ہونے اور چلنے سے روکنے کے خوف اور اس کے حالات کے خوفناک ہونے (یعنی) اس کے اضطراب اور اس کے موجیں مارنے وغیرہ سبھی کو شامل ہے۔ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ، ضَلَّ اس کا معنی ضائع ہونا اور مفقود ہونا، اور گم ہونا ہے اور یہ ان کی تحقیر سے عبارت ہے جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا بطور الٰہ پکارا جاتا ہے۔ اور اس آیت میں اس کا معنی یہ ہے کہ کفار بلاشبہ اپنے بتوں کے بارے یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ وہ شفاعت اور سفارش کرنے والے ہیں، اور یہ کہ ان کو فضیلت حاصل ہے، اور ان میں سے ہر ایک فطرت کے مطابق یہ علم رکھتا ہے جو وہ اپنے دفاع پر قدرت نہیں رکھتا کہ ان بڑی بڑی مصیبتوں اور تکلیفوں میں بتوں کا کوئی عمل اور فعل نہیں ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اس سے متعلق سمندر کی حالت پر انہیں واقفیت دلائی کہ جہاں حیلے اور وسائل کٹ جاتے ہیں، ختم ہو جاتے ہیں۔ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ پس جب وہ تمہیں خلاصی عطا فرما کر ساحل پر پہنچا دیتا ہے تو تم روگردانی کرنے لگتے ہو۔ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (اور انسان (واقعی) بڑا ناشکرا ہے) یہاں انسان سے مراد کافر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: نعمتوں کی ناشکری انسان کی طبع اور مزاج ہے سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ بچالے۔ پس یہاں انسان بطور جنس کے مذکور ہے۔

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ یُرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا ۝۶۸

''کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے کہ اللہ دھنسا دے تمہارے ساتھ خشکی کے کنارہ کو یا بھیج دے تم پر اولے برسانے والا بادل پھر اس وقت تم نہیں پاؤ گے اپنے لئے کوئی کارساز۔''

قولہ تعالیٰ: اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ یہ بیان فرمایا کہ وہ خشکی میں بھی انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہے اگرچہ وہ سمندر سے صحیح سالم بچ جائیں۔ اور الخسف کا معنی ہے زمین کا کسی چیز کے ساتھ دھنس جانا)۔ کہا جاتا ہے: بئر خسیف جب کنوئیں کی اصل اور بنیاد گر جائے۔ اور عین خاسف یعنی آنکھ کی سیاہی سر میں دھنس گئی اور عین من الماء خاسفة یعنی چشمے کا

پانی نیچے دھنس گیا۔ اور خسفت الشمس یعنی سورج زمین سے چھپ گیا (سورج کو گرہن لگ گیا)۔ اور ابو عمرو نے کہا ہے: الخسیف وہ کنواں ہے جو پتھروں میں کھودا جاتا ہے اور اس کا پانی کثیر اور زیادہ ہونے کے سبب ختم نہ ہو۔ اور اس کی جمع خُسُف ہے۔ اور جَانِبَ الْبَرِّ سے مراد زمین کا کنارہ ہے۔ اور اس کا نام جانب رکھا ہے کیونکہ وہ دھنسنے کے بعد جانب (کنارہ) ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہ سمندر ایک جانب ہے اور خشکی ایک جانب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک وہ ساحل سمندر پر تھے، اور اس کا ساحل خشکی کا کنارہ ہے، اور وہ اس میں سمندر کی ہولناکیوں سے پر امن تھے، پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے ڈرایا جس سے وہ خشکی میں محفوظ تھے جیسا کہ انہیں اس سے ڈرایا جس کا انہیں سمندر میں خوف تھا (1)۔ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا (الملک: 17) یعنی یا وہ تم پر شدید آندھی بھیج دے۔ اور یہ وہ ہے جو سنگریزے پھینکتی ہے۔ اور الحصباء سے مراد چھوٹے چھوٹے پتھر ہیں (سنگریزے)؛ یہ ابو عبیدہ اور قتبی نے کہا ہے۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ وہ آسمان سے پتھر ان پر برسائے، جیسا کہ قوم لوط کے ساتھ کیا گیا۔ اور اس بادل کو بھی حاصب کہا جاتا ہے جو اولے برساتا ہے: حاصب اور اس ہوا کو جو مٹی اور سنگریزے کو اٹھا کر لاتی ہے حاصب کہا جاتا ہے اور حَصِبَةٌ بھی۔

جیسا کہ لبید نے کہا ہے:

جرّت علیها أن خَوَتْ من أهلها　　　أذیالَها كلُّ عَصُوفٍ حَصِبه

اور فرزدق نے کہا ہے:

مستقبلین شَمَال الشام یضربنا　　　بحاصب كنَدِیف القطن منثور(2)

ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِیْلًا پھر اس وقت اپنے لئے تم کوئی محافظ اور مددگار نہیں پاؤ گے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچالے۔

اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ فَیُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَیْنَا بِهٖ تَبِیْعًا ﴿۶۹﴾

''کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے سمندر میں دوسری مرتبہ اور بھیجے تم پر سخت آندھی جو کشتیوں کو توڑنے والی ہو پھر غرق کر دے تمہیں بوجہ کفر کے جو تم نے کیا پھر تم نہیں پاؤ گے اپنے لئے ہم سے اس ڈبونے پر کوئی انتقام لینے والا۔''

قولہ تعالیٰ: اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ یُّعِیْدَكُمْ فِیْهِ تَارَةً اُخْرٰى (کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دوسری مرتبہ لے جائے) سمندر میں۔ فَیُرْسِلَ عَلَیْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیْحِ، القاصف، وہ سخت اور تیز ہوا جو اپنی شدت کے ساتھ (ہر شے کو) توڑ دیتی ہے۔ یہ قصف الشیٔ یقصفه سے ماخوذ ہے، یعنی اس نے اسے شدت اور سختی کے ساتھ توڑ دیا۔ اور القصف کا معنی توڑنا ہے۔ کہا جاتا ہے: قصفت الریح السفینة (ہوا نے کشتی کو توڑ دیا) اور ریح قاصف یعنی شدید آندھی۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 257　　2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 143

اور رعد **قاصف** سخت آواز والی گرج۔ کہا جاتا ہے: **قصف الرعدُ وغیرُہ قصِیفا** (گرج وغیرہ نے سخت آواز نکالی) اور **التقصف** کا معنی ہے درختوں کو توڑنے والی۔ اور التقصف، اس کا معنی ٹوٹنا اور توڑنا ہے۔ اور التقصف کا معنی لہو ولعب بھی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ (معنی) نیا پایا گیا ہے۔ **فَيُغْرِقَكُم بِمَا كَفَرْتُمْ** پھر وہ تمہیں تمہارے کفر کے سبب غرق کر دے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے نَّخْسِفَ بِكُمْ، اَوْ نُرْسِلَ عَلَيْكُمْ، اَنْ نُّعِيْدَكُمْ، فَنُرْسِلَ عَلَيْكُمْ، فَنُغْرِقَكُمْ پانچوں مقامات پر تعظیم کی بنا پر نون کے ساتھ پڑھا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے قول عَلَيْنَا کی وجہ سے (نون کے ساتھ پڑھا ہے) اور باقیوں نے یا کے ساتھ، کیونکہ آیت میں اس سے پہلے اِیَّاهُ ہے۔ اور ابو جعفر، شیبہ، رویس اور مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ نے فَتُغْرِقَكُم تا کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ریح (ہوا) کی صفت ہے۔ اور حسن اور قتادہ سے فیغرّقکم یا اور را کی تشدید کے ساتھ منقول ہے۔ اور ابو جعفر نے یہاں اور پورے قرآن میں الریاح پڑھا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک قاصف وہ ہے جو خشکی میں ہلاک کرنے والی ہو، اور عاصف وہ ہے جو سمندر میں غرق کرنے والی ہو؛ اسے ماوردی نے بیان کیا ہے(1)۔ اور قول باری تعالیٰ: ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: پھر تم اس پر ہم سے کوئی بدلہ لینے والا نہیں پاؤ گے(2)۔ نحاس نے کہا ہے: (ثائر) یہ الثار سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح ہر انتقام اور بدلہ کا مطالبہ کرنے والے کو تبیع اور تابع کہا جاتا ہے؛ اور اسی سے **فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ** (البقرہ: 178) ہے ای مطالبة نیکی کا مطالبہ کرنے والا۔

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

"اور بے شک ہم نے بڑی عزت بخشی اولاد آدم کو اور ہم نے سوار کیا انہیں (مختلف سواریوں پر) خشکی میں اور سمندر میں اور رزق دیا انہیں پاکیزہ چیزوں سے اور ہم نے فضیلت دی انہیں بہت سے چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا فرمایا نمایاں فضیلت"۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ الآیہ۔ جب ترہیب اور ڈرانے والی چیزوں میں سے جن کا ذکر کیا سو کیا تو ساتھ ہی ان پر انعام و اکرام کا بھی ذکر کیا۔ كَرَّمْنَا یہ کرم کو مضاعف بنا کر (یعنی عین کلمہ کو مشدد کر کے) پڑھا ہے، یعنی ہم نے انہیں عزت اور شرف و فضل عطا فرمایا۔ یہ وہ عزت ہے جس نے نقصان اور کمی کی نفی کی ہے نہ کہ اس سے مراد مال کی عزت ہے۔ اور اس عزت و کرامت میں انہیں اس ہیئت یعنی سیدھے قد اور حسین صورت پر پیدا کرنا بھی داخل ہے، اور انہیں بر و بحر میں سوار کرنا بھی ان چیزوں سے ہے جو سوائے انسان کے کسی حیوان کے لئے صحیح نہیں کہ وہ اپنے ارادہ، قصد اور تدبیر کے ساتھ سوار ہو سکے۔ اور ان کی تخصیص ان چیزوں کے ساتھ بھی ہے کھانے، پینے اور لباس میں سے جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص کیا ہے۔ اور اس میں انسان کی وسعت کی مثل کوئی حیوان وسعت نہیں رکھتا، کیونکہ خاص طور پر وہی مال کماتے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 257 2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 145

ہیں نہ کہ دیگر حیوان، اور وہ کپڑے پہنتے ہیں اور طرح طرح کے مرکب کھانے کھاتے ہیں۔ اور ہر حیوان کی غایت یہ ہے کہ وہ کچا گوشت یا غیر مرکب کھانا کھاتا ہے۔ اور علامہ طبری نے ایک جماعت سے یہ بیان کیا ہے کہ ابن آدم کی وجہ فضیلت یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے کھاتا ہے اور باقی تمام حیوان منہ سے کھاتے ہیں۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے؛ اسے مہدوی اور نحاس نے ذکر کیا ہے اور یہی کلبی اور مقاتل کا قول ہے؛ اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے (1)۔ اور ضحاک نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں بولنے اور تمیز کی قوت کے ساتھ عزت عطا فرمائی۔ حضرت عطا نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں سیدھے قد اور اس کے بڑھنے کی فضیلت دی۔ یمان نے کہا ہے: حسن صورت کے ساتھ فضیلت دی۔ محمد بن کعب نے کہا ہے: انہیں اس سے فضیلت دی کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بنایا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مردوں کو داڑھی کے ساتھ اور عورتوں کو مینڈھیوں کے ساتھ فضیلت دی۔ اور محمد بن جریر طبری نے کہا ہے: انہیں تمام مخلوق پر مسلط کر کے اور تمام مخلوق کو ان کے لئے مسخر کر کے انہیں عزت و تکریم عطا کی (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کلام کرنے اور لکھنے کی قوت کے ساتھ فضیلت دی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فہم و فراست اور تمیز کی قوت کے ساتھ فضیلت دی۔ اور وہ صحیح قول جس پر تعویل کی جاسکتی ہے کہ بلاشبہ انسان کی فضیلت کا سبب عقل ہے جو مکلف بنائے جانے کی اصل اور بنیاد ہے، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے اس کا کلام سمجھا جاتا ہے، اور اس کی نعمتوں اور رسل علیہم السلام کی تصدیق تک پہنچا جاسکتا ہے، مگر یہ کہ جب بندے کے لئے تمام مقصود اور مدعیٰ واضح نہ ہوا تو رسول مبعوث کئے گئے اور کتابیں نازل کی گئیں۔ پس شریعت کی مثال سورج ہے، اور عقل کی مثال آنکھ ہے، پس جب وہ کھلی ہو اور صحیح و تندرست بھی ہو تو وہ سورج کو دیکھ سکتی ہے اور اشیاء کی تفاصیل کا ادراک کرسکتی ہے۔ اور جو اقوال اوپر مذکور ہوئے ہیں ان میں سے بعض بعض سے قوی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے بعض حیوانوں میں ایسے خصائل رکھ دیے ہیں جن کے ساتھ وہ ابن آدم سے بھی افضل ہیں، مثلاً گھوڑے کا دوڑنا، اس کا سننا اور اس کا دیکھنا، ہاتھی کی قوت، شیر کی شجاعت اور بہادری اور مرغ کی سخاوت، تو بلاشبہ تکریم و تفضل عقل کے ساتھ ہے جیسا کہ ہم نے بیان کردیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ ایک جماعت نے کہا ہے: یہ آیت انسانوں اور جنوں پر ملائکہ کو فضیلت دینے کا تقاضا کرتی ہے اس حیثیت سے کہ ان کی اس قول باری تعالیٰ میں استثنا کی گئی ہے: وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ (النساء: 172) (اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے)) اور یہ آیت سے لازم نہیں آتا، بلکہ اس میں انسانوں اور جنوں کے درمیان فضیلت کا ذکر ہے، کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر وہ چیزیں شمار کرائی ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام حیوانوں سے خاص کیا ہے، اور جن تو بہت زیادہ مفضول ہیں (یعنی ان پر تو بہت زیادہ فضیلت دی گئی ہے۔) اور ملائکہ ان بہت زیادہ مفضول سے خارج ہیں، لہٰذا آیت نے ان کے ذکر کو نہیں چھیڑا، بلکہ یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ ملائکہ افضل ہوں، اس کے برعکس کا احتمال بھی ہوسکتا ہے، اور مساوی ہونے کا احتمال بھی ہوسکتا ہے، المختصر یہ کہ کلام اس مسئلہ میں کسی یقین کی حد تک نہیں پہنچتی۔ تحقیق ایک قوم اس بارے میں کلام کرنے سے دور رہی جیسا کہ وہ بعض انبیاء علیہم السلام کو بعض پر فضیلت دینے کے بارے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 257
2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 145

کلام کرنے سے دور رہے اور بچے رہے، کیونکہ حدیث میں ہے: "تم انبیاء علیہم السلام کے درمیان پسند و اختیار کے اعتبار سے موازنہ نہ کرو اور نہ تم مجھے یونس بن متی پر فضیلت دو۔" اور یہ کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے درمیان بعض کو بعض پر فضیلت دینے کے بارے نص موجود ہے۔ ہم نے اسے سورۃ البقرہ میں بیان کر دیا ہے۔ اور اس میں ملائکہ اور مومن کی تفضیل کے بارے کلام گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ یعنی ہم نے انہیں لذیذ کھانے اور مشروبات عطا فرمائے۔ مقاتل نے کہا ہے: مراد گھی، شہد، مکھن، کھجور اور حلوا (اور میٹھا پھل وغیرہ) ہیں، اور انسانوں کے سوا دیگر حیوانوں کا جو رزق بنایا وہ تم پر مخفی نہیں ہے مثلاً بھوسہ اور ہڈیاں وغیرہ۔ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا اور ہم نے انہیں بہت سے چوپاؤں، جانوروں، درندوں، پرندوں پر غلبہ اور تسخیر کے ساتھ، ثواب اور جزا، حفظ و تمیز اور صحیح فہم و فراست کے ساتھ فضیلت دی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ یہ آیت اسے رد کرتی ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے آپ کو عمدہ کھانے سے دور رکھو کیونکہ یہ شیطان کو قوی کرتا ہے وہ اس قوت سے رگوں میں دوڑتا ہے۔" اور اس سے بہت سے صوفیاء لذیذ اور عمدہ کھانے ترک کرنے پر استدلال کرتے ہیں، اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے، کیونکہ قرآن کریم اس کا رد کرتا ہے، اور سنت ثابتہ اس کے خلاف ہیں، جیسا کہ کئی مقامات پر بیان ہو چکا ہے۔ اور ابو حامد طوسی نے بیان کیا ہے کہ حضرت سہل ایک مدت تک بیری کے پتوں سے خوراک حاصل کرتے رہے، اور دقاق نے تین سال تک بھوسہ کے پتے کھائے۔ اور ابراہیم ابن البنا نے ذکر کیا ہے کہ میں اخمیم سے اسکندریہ تک ذوالنون کے ساتھ رہا، پس جب بھی آپ کی افطاری کا وقت آتا تو میں ایک روٹی اور نمک نکالتا جو میرے پاس تھا، اور میں کہتا: آؤ، تو وہ مجھے کہتے: کیا تیرا نمک کوٹا ہوا ہے؟ میں کہتا: ہاں۔ فرماتے: تو کامیاب نہیں ہوگا، تو میں نے ان کے توشہ دان کی طرف دیکھا تو اس میں تھوڑے سے جو کے ستو تھے وہ ان سے پھانک لیتے تھے۔ اور ابو یزید نے کہا ہے: میں نے چالیس سال تک ان میں سے کوئی شے نہیں کھائی جو بنی آدم کھاتے ہیں۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: یہ ان چیزوں میں سے ہے جس پر نفس کو ابھارنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو گندم کے ساتھ عزت و تکریم دی ہے اور اس کے چھلکے کو جانوروں کے لئے بنایا ہے، لہٰذا بھوسہ کھانے میں چوپاؤں کی مزاحمت کرنا صحیح نہیں ہے، اور رہے جو کے ستو تو یہ قولنج کا سبب بنتے ہیں، اور جب انسان جو کی روٹی اور کوٹے ہوئے نمک پر اقتصار کرے تو اس کا مزاج بدل جاتا ہے، کیونکہ جو کی روٹی خشک ٹھنڈی ہے، اور نمک خشک قابض ہے جو دماغ اور بصارت کو نقصان دیتا ہے۔ اور جب نفس اس شے کی طرف مائل ہو جو اس کی اصلاح کرتی ہے اور پھر اسے روک دیا جائے تو اس طرح اسے رد کر کے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حکمت کا مقابلہ کیا گیا، پھر یہ بدن میں بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ پس یہ فعل شرع اور عقل دونوں کے مخالف ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ بدن آدمی کی سواری ہے، اور جب اس نے سواری کے ساتھ دوستی کا برتاؤ نہ کیا تو وہ اسے (منزل پر) نہیں پہنچائے گی۔ اور حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ انہوں نے مکھن، شہد، اور سفید آٹے کی روٹی خریدی، تو انہیں کہا گیا: یہ سب کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: جب ہم نے پایا تو ہم

مردوں کی طرح کھائیں گے، اور جب ہم نے کچھ نہ پایا تو ہم مردوں کے صبر کرنے کی طرح صبر کریں گے۔ اور حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ گوشت، انگور، اور فالوذج (آٹے، پانی اور شہد سے تیار کیا ہوا کھانا) کھاتے تھے پھر نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اسلاف میں اس کی کثیر مثالیں ہیں۔ اور اس میں کچھ سورۃ المائدہ اور الاعراف وغیرہ میں گزر چکا ہے اور وہ کافی ہے۔ اور پہلا نظریہ دین میں غلو ہے اگر ان کے بارے میں یہ صحیح ہے۔ وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (الحدید: 27) (اور رہبانیت کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔)

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ أُوتِيَ كِتٰبَهُ بِيَمِينِهِ فَأُولٰٓئِكَ يَقْرَءُونَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝

''وہ دن جب ہم بلائیں گے تمام انسانوں کو ان کے پیشوا کے ساتھ، پس وہ شخص جس کو دیا گیا اس کا نامۂ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں تو یہ لوگ (خوشی خوشی) پڑھیں گے اپنا نامۂ عمل اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

قولہ تعالیٰ: يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ: يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ کے بارے میں فرمایا: ''ان میں سے ایک کو بلایا جائے گا اور اس کا نامۂ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اور اس کا جسم اس کے لئے ساٹھ گز تک پھیلا دیا جائے گا اور اس کا چہرہ روشن کر دیا جائے گا اور اس کے سر پر موتیوں کا تاج رکھا جائے گا جو چمک رہا ہوگا پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف چل کر آئے گا اور وہ دور سے ہی اسے دیکھ لیں گے اور کہنے لگیں گے: اے اللہ! ہمیں بھی اس کی مثل عطا فرما اور ہمارے لئے اس میں برکت عطا فرما یہاں تک کہ وہ ان کے پاس پہنچ جائے گا۔ اور کہے گا: تمہیں بشارت (اور مبارک) ہو تم میں سے ہر ایک کے لئے اسی کی مثل ہے فرمایا۔ اور رہا کافر! تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا اور اس کا جسم اس کے لئے آدم کی صورت پر ساٹھ گز بڑھا دیا جائے گا اور اسے ایک تاج پہنایا جائے گا پس اس کے ساتھی اسے دیکھیں گے، تو کہیں گے: ہم اللہ تعالیٰ سے اس شر سے پناہ مانگتے ہیں! اے اللہ! تو ہمیں اس طرح کا نہ دینا۔ بیان فرمایا: پس وہ ان کے پاس آئے گا اور وہ کہیں گے: اے اللہ! اسے رسوا اور ذلیل کر، تو وہ کہے گا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں (رحمت سے) دور ہٹا دیا ہے کیونکہ تم میں سے ہر آدمی کے لئے اسی کی مثل ہے(1)''۔ ابو عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور اس کی نظیر یہ قول باری تعالیٰ ہے: وَتَرٰى كُلَّ أُمَّةٍ جَاثِيَةً ۗ كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعٰٓى إِلٰى كِتٰبِهَا ۖ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (الجاثیہ) (اور آپ دیکھیں گے ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا ہوا۔ ہر گروہ کو بلایا جائے گا اس کے صحیفہ (عمل) کی طرف۔ (انہیں کہا جائے گا) آج تمہیں بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔)

اور کتاب (نامۂ عمل) کو امام کا نام دیا جا رہا ہے، کیونکہ ان کے اعمال کی پہچان کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اور حضرت ابن عباس، حسن، قتادہ، اور ضحاک رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: بِإِمَامِهِمْ سے مراد بکتابھم ہے یعنی ان میں سے ہر

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الاسراء، جلد 2، صفحہ 141۔ ایضاً، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3061، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انسان کو اس کتاب کے ساتھ بلایا جائے گا جس میں اس کے عمل ہوں گے(1))۔ اور اس کی دلیل فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: اس سے مراد ان پر نازل کی گئی کتاب ہے(2)، یعنی ہر انسان کو اس کتاب کے ساتھ بلایا جائے گا جس کی وہ تلاوت کرتا تھا، پس اہل تورات کو تورات کے ساتھ اور اہل قرآن کو قرآن کے ساتھ بلایا جائے گا، اور کہا جائے گا: اے اہل قرآن! تم نے کون سے عمل کیے ہیں، کیا تم نے اس کے اوامر کی پیروی کی ہے، کیا تم نے اس کی نواہی سے اجتناب کیا ہے؟ اور اسی طرح کے سوال کیے جائیں گے اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بِاِمَامِهِمْ سے مراد بِنَبِیِّهِمْ ہے(3) (یعنی انہیں اپنے نبی کے ساتھ پکارا جائے گا۔) اور امام وہ ہوتا ہے جس کی اقتدا کی جاتی ہے۔ اور کہا جائے گا: آؤ ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرنے والو!، آجاؤ موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے والو!، آجاؤ شیطان کی اتباع کرنے والو!، آجاؤ بتوں کی پیروی کرنے والو!۔ پس اہل حق اٹھیں گے اور وہ اپنے نامہ عمل اپنے دائیں ہاتھوں میں پکڑیں گے، اور اہل باطل اٹھیں گے اور وہ اپنے نامہ عمل اپنے بائیں ہاتھوں میں پکڑیں گے۔ اور یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مراد بامام عصرھم ہے (یعنی انہیں اپنے زمانے کے امام کے ساتھ بلایا جائے گا۔) اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ: یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر ایک کو اپنے زمانے کے امام اور اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی سنت کے ساتھ بلایا جائے گا“ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرنے والو! آجاؤ، اے موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے والو تم آجاؤ! اے عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کرنے والو! تم آجاؤ، اور اے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والو! تم آجاؤ۔ پس اہل حق اٹھیں گے اور اپنا نامہ عمل اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیں گے اور پھر وہ فرمائے گا: اے شیطان کی اتباع کرنے والو! تم آجاؤ، اے ضلالت و گمراہی کے سرداروں کی پیروی کرنے والو تم آجاؤ درآنحالیکہ ہر ایک کے لئے ہدایت کا امام بھی ہوگا اور گمراہی کا امام بھی ہوگا(4)“۔ (اسی کے ساتھ اسے بلایا جائے گا)۔ حسن اور ابو العالیہ نے کہا ہے: بِاِمَامِهِمْ سے مراد بأعمالھم ہے(5) (یعنی انہیں ان کے اعمال کے ساتھ بلایا جائے گا)۔ اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کہا جائے گا: کہاں ہیں تقدیر کے ساتھ راضی ہونے والے؟ کہاں ہیں اس چیز سے صبر کرنے والے جس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کے مذاہب ہیں، پس انہیں ان کے ساتھ پکارا جائے گا جن کی وہ دنیا میں اقتدا کرتے تھے، اے حنفی، اے شافعی، اے معتزلی، اے قدری وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ اس کی اتباع کرتے ہوں خیر میں یا شر میں، حق پر یا باطل پر، اور ابو عبیدہ کے قول کا یہی معنی ہے۔ اور وہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: صدقہ دینے والوں کو باب الصدقہ سے اور جہاد کرنے والوں کو باب الجہاد سے بلایا جائے گا الحدیث۔ یہ طویل حدیث ہے۔ ابو سہانے کہا ہے: کہا جائے گا فلاں نمازی اور روزے دار کہاں ہیں؟ اور اس کا برعکس دف بجانے والے اور چغلخور رہیں۔ اور محمد بن کعب نے کہا ہے بِاِمَامِهِمْ سے مراد بأمھاتھم ہے (یعنی

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 258 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ موسوعۃ اطراف حدیث النبوی الشریف، جلد 6، صفحہ 452 5۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 146

انہیں اپنی ماؤں کے ساتھ پکارا جائے گا) اور امام اُمّ کی جمع ہے۔ حکماء نے کہا ہے: اس میں حکمت کی تین وجہیں ہیں؛ ان میں ایک یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے۔ اور دوسری یہ ہے ...... امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کے شرف وعظمت کے اظہار کے لئے۔ اور تیسری وجہ یہ ہے .. تاکہ زنا کی اولاد رسوا نہ ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول محل نظر ہے، کیونکہ حدیث صحیح میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اولین و آخرین تمام کو جمع فرمائے گا تو ہر خیانت کرنے والے کے لئے جھنڈا بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا: یہ فلاں بن فلاں کی خیانت ہے''۔ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ دونوں نے روایت کیا ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: هٰذه غَدْرَة فلان بن فلان یہ اس پر دلیل ہے کہ آخرت میں لوگوں کو ان کے اپنے ناموں اور ان کے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا، اور یہ روایت اس کا رد کرتی ہے جس نے یہ کہا ہے کہ انہیں ان کی ماؤں کے ناموں سے بلایا جائے گا کیونکہ اسمیں ان کے باپوں کے بارے ستر پوشی ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ یہ ان کے قول کو تقویت دیتا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ بِاِمَامِهِمْ سے مراد بکتابھم ہے۔ اور اسے یہ قول بھی قوت دیتا ہے: وَ كُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ۝ (یٰسین) (اور ہر چیز کو ہم نے شمار کر رکھا ہے لوح محفوظ میں)۔ فَاُولٰٓىِٕكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا۔ الفتیل وہ ہے جتنی گٹھلی کی ایک طرف یا ایک حصہ ہوتا ہے اور یہ سوۃ النساء میں گزر چکا ہے۔

وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا ۝

''اور جو شخص بنا رہا اس دنیا میں اندھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا اور بڑا گم کردہ راہ ہوگا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى یعنی جو دنیا میں نظر وفکر کرنے سے اور حق کو دیکھنے سے اندھا بنا رہے گا۔ فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ تو وہ آخرت کے معاملہ میں بھی اَعْمٰى اندھا ہوگا۔ اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اہل یمن کی ایک جماعت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوئی اور انہوں نے اس آیت کے بارے سوال کیا تو آپ نے فرمایا: اس کے ماقبل کو پڑھو۔ رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ ...... تا قولہ ... تَفْضِیْلًا ۝ (الاسراء) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو آدمی ان نعمتوں اور ان آیات اور نشانیوں کے بارے جو اس نے دیکھیں اندھا بنا رہا تو وہ اس آخرت کے بارے میں جسے اس نے دیکھا نہیں اندھا ہی ہوگا اور بڑا گم کردہ راہ ہوگا (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے جو ان نعمتوں سے اندھا رہا جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اس پر دنیا میں فرمائی ہیں تو وہ آخرت کی نعمتوں سے بھی اندھا ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے وہ آدمی جو اس دنیا میں جس میں مہلت دی گئی ہے اور اس کو وسعت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ توبہ قبول کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ اندھا بنا رہا تو وہ اس آخرت میں جس میں کوئی توبہ نہیں اندھا ہی ہوگا۔ اور حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جو آدمی اس دنیا میں کافر اور گمراہ رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا اور گم

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 474

کردہ راہ ہوگا(1)۔ اور یہ بھی قول ہے: وہ آدمی جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے دلائل سے اندھا بنا رہا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن اندھا ہی اٹھائے گا؛ جیسا کہ اس نے ارشاد فرمایا: وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۝ الآیات۔ (طٰہٰ) (اور ہم اسے اٹھائیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے۔) اور مزید فرمایا: وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (الاسراء: 97) (اور ہم اٹھائیں گے انہیں قیامت کے روز منہ کے بل اس حال میں کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمام اقوال میں فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى میں اس کا معنی ہے: سخت اندھا ہوگا، کیونکہ وہ دل کا اندھا ہوتا ہے، اور آنکھ کے اندھے کے بارے میں اس کی مثل نہیں کہا جا سکتا۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا ہے: کیونکہ وہ بھی خلقت کے اعتبار سے ہاتھ اور پاؤں کی طرح ہی ہے، لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا ما اعماہ جیسا کہ یہ نہیں کہا جا سکتا ما أیداہ۔ اخفش نے کہا ہے: اس میں یہ نہیں کہا گیا کیونکہ اس کے حروف تین سے زائد ہیں۔ اور اس کی اصل اعمی ہے۔ اور بعض نحویوں نے ما أعماہ اور ما أعشاہ کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ اس کا فعل عَمِی اور عَشِی ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: ایک بصری شیخ نے مجھے شام میں بتایا کہ اس نے عربوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ما اسود شعرہ۔

جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ما فی المعالی لکم ظل و لا ثمر   و فی المخازی لکم أشباح أشیاخ

أما الملوک فأنت الیوم ألأمهم   لؤما و أبیضهم سِربال طباخ

اور ابوبکر، حمزہ، کسائی اور خلف نے دو حرفوں اعمی اور اعمی میں امالہ کہا ہے اور باقیوں نے ان میں فتح پڑھا ہے۔ اور ابوعمرو نے پہلے میں امالہ کیا ہے اور دوسرے کو فتح دیا ہے۔ وَاَضَلُّ سَبِيْلًا یعنی وہ ہدایت کی طرف کوئی راہ نہیں پائے گا۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖۗ وَ اِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا۝

''اور انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو برگشتہ کر دیں اس (کتاب) سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے تا کہ آپ بہتان باندھ کر (منسوب کریں) ہماری طرف اس کے علاوہ تو اس صورت میں وہ آپ کو اپنا گہرا دوست بنا لیں گے۔''

حضرت سعید بن جبیر نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم طواف کے دوران حجر اسود کا استلام کر رہے تھے، تو قریش نے آپ کو منع کیا اور کہا: ہم تمہیں استلام کی اجازت نہیں دیں گے یہاں تک کہ تم ہمارے الٰہوں کے بھی قریب ہو، تو آپ نے اپنے دل میں خیال کیا اور کہا: مجھ پر نہیں ہے کہ میں ان کے قریب ہوں اس کے بعد کہ وہ مجھے استلام حجر کی اجازت دیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔'' پس اللہ تعالیٰ نے اس کا انکار کیا اور آپ پر یہ آیت نازل فرمائی، یہ حضرت مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے(2)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عطا کی روایت میں کہا ہے: یہ آیت ثقیف کے وفد کے

1۔ تفسیر حسن بصری، جلد 4، صفحہ 37   2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 259

بارے نازل ہوئی، اور انہوں نے آپ ﷺ سے ایسا مطالبہ کیا جو حق سے دور تھا انہوں نے کہا: ایک سال تک ہمیں اپنے خداؤں سے منافع حاصل کرنے دیں یہاں تک کہ ہم وہ لے لیں جو انہیں ہدایا پیش کئے جاتے ہیں، پس جب ہم اسے لے لیں گے تو ہم انہیں توڑ دیں گے اور ہم اسلام قبول کر لیں گے، اور آپ ہماری وادی کو اسی طرح حرم قرار دیجئے جیسے مکہ کرمہ کو حرم قرار دیا ہے، تاکہ عرب اپنے اوپر ہماری فضیلت کو جان لیں، پس رسول اللہ ﷺ نے یہ انہیں عطا کرنے کا قصد وارادہ کیا تب یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اکابرین قریش نے حضور نبی مکرم ﷺ کو کہا: آپ ان گرنے والے (کمزور لوگوں) کو اور ان غلاموں کو ہم سے دور بھگایئے تاکہ ہم آپ کے ساتھ بیٹھیں اور آپ سے کچھ سن سکیں، تو آپ ﷺ نے اس کا ارادہ کر لیا یہاں تک کہ آپ کو اس سے منع کر دیا گیا۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ قریش ایک رات صبح تک رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خلوت اور تنہائی میں رہے اور آپ کے ساتھ گفتگو کرتے رہے، آپ کی شان بیان کرتے رہے، آپ کو سردار بنانے اور آپ کو اپنے قریب لانے کی کوشش کرتے رہے، اور کہنے لگے: بلاشبہ آپ جو شے لائے ہیں وہ لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں لاسکتا، اے ہمارے آقا! آپ تو ہمارے سردار ہوئے، وہ اسی طرح کرتے رہے یہاں تک کہ آپ ان بعض امور میں ان کے قریب ہونے لگے جو وہ چاہتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے محفوظ رکھ لیا، بچا لیا (2)، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور لَيَفْتِنُوْنَكَ کا معنی ہے وہ آپ کو برگشتہ کرتے ہیں، پھسلاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: فتنتُ الرجل من رأیه جب تو کسی آدمی کو اس رائے سے پھسلا دے، پھیر دے جس پر وہ تھا؛ یہ ہروی نے کہا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ آپ کو پھراتے ہیں (یزیلونك اور یصرفونك) دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ یعنی قرآن کریم کے حکم سے، کیونکہ انہیں وہ دینے میں جس کا انہوں نے سوال اور مطالبہ کیا ہے اس میں قرآن کریم کے حکم کی مخالفت ہے۔ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ یعنی تاکہ آپ ایسا بہتان تراش کر ہماری طرف منسوب کر دیں جو اس کے خلاف ہو جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے، اور وہ ثقیف کا یہ قول ہے کہ آپ ہماری وادی کو اسی طرح حرام قرار دیجئے جیسے آپ نے مکہ مکرمہ کو حرام قرار دیا ہے، (یعنی) اس کے درختوں کو، اس کے پرندوں کو، اور اس کے وحشی جانوروں کو، اور اگر عرب آپ سے پوچھیں: آپ نے انہیں کیوں خاص کیا؟ تو آپ یہ فرمایئے: اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے مجھے حکم دیا ہے، تاکہ وہ آپ کے لئے عذر ہو جائے۔ وَ اِذًا لَّا تَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا یعنی اگر آپ وہ کریں جو وہ چاہتے ہیں تو وہ آپ کو گہرا دوست بنا لیں گے، یعنی وہ آپ سے محبت کریں گے اور آپ کی طرف مائل ہو جائیں گے؛ (خلیل) الخُلّه (خا کے ضمہ کے ساتھ) سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد دوستی ہے کیونکہ آپ ان کے ساتھ موافقت کریں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَّا تَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا یعنی وہ آپ کو فقیر اور محتاج بنا دیں گے۔ یہ الخَلّة (خا کے فتحہ کے ساتھ) سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد فقر ہے کیونکہ آپ ان کے حاجت مند اور محتاج ہو جائیں گے۔

وَ لَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 260-259

2۔ تفسیر طبری، جلد 16-15، صفحہ 150

الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝

''اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ ضرور مائل ہو جاتے ان کی طرف کچھ نہ کچھ۔ (بفرض محال اگر آپ ایسا کرتے) تو اس وقت ہم آپ کو چکھاتے دوگنا عذاب دنیا میں اور دوگنا عذاب موت کے بعد پھر آپ نہ پاتے اپنے لئے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار''

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ یعنی اگر ہم نے آپ کو حق پر ثابت قدم نہ رکھا ہوتا اور ہم نے آپ کو ان کی موافقت سے نہ بچایا ہوتا۔ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ تو آپ ان کی طرف مائل ہو جاتے۔ شَيْئًا قَلِيْلًا یعنی تھوڑا اور کچھ نہ کچھ۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عرض کی: اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِي اِلٰى نفسی طرفة عین (1) (اے اللہ! تو مجھے آنکھ جھپکنے کی دیر بھی میرے نفس کے حوالے نہ کر۔) اور کہا گیا ہے: خطاب کا ظاہر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے اور اس کا باطن ثقیف کے بارے خبر دے رہا ہے۔ اور اس کا معنی ہے: وان کادوا لیر کنونك، یعنی قریب تھا کہ وہ آپ کے بارے یہ خبر دیتے کہ آپ ان کے قول کی طرف مائل ہو گئے ہیں، پس ان کے فعل کو مجازاً اور وسعۃً آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جیسا کہ تو کسی آدمی کو کہتا ہے: کدت تقتل نفسك (قریب ہے تو اپنے آپ کو قتل کر دے)، یعنی قریب ہے لوگ تجھے اس سبب سے قتل کر دیں جو تو نے فعل کیا ہے، اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ کی طرف سے ان کی طرف مائل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں بنا، بلکہ اس کا معنی ہے: اگر آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا تو آپ یقیناً ان کی موافقت کی طرف مائل ہو جاتے لیکن آپ پر مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کا فضل رہا سو آپ نے ایسا نہ کیا؛ یہ علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں، لیکن یہ امت کی تعریف ہے تاکہ ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی شرائع میں سے کسی شی میں مشرکین کی طرف مائل نہ ہو۔

اور قولہ تعالیٰ: اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ یعنی (بفرض محال) اگر آپ مائل ہوتے تو آپ کو دنیا میں دنیا کے عذاب کی دو مثل اور آخرت میں موت کے عذاب کی دو مثل چکھاتے؛ یہ حضرت ابن عباس اور مجاہد رحمہما اللہ وغیرہ نے کہا ہے (2)۔ اور یہ انتہائی وعید ہے۔ اور جب بھی رتبہ اور درجہ اعلیٰ اور بلند ہو تو مخالفت کی صورت میں عذاب بھی اتنا بڑا ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (الاحزاب: 30) (اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی تو اس کے لئے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا۔)

اور ضعف الشی سے مراد دو مرتبہ اس کی مثل ہونا ہے (دوگنا)، اور کبھی ضعف کا معنی حصہ بھی ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِكُلٍّ ضِعْفٌ (الاعراف: 38) یعنی ہر ایک کے لئے ایک حصہ ہے، یہ معنی سورۃ الاعراف میں گزر چکا ہے۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 475 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 260

''اور انہوں نے ارادہ کرلیا ہے کہ پریشان و مضطرب کردیں آپ کو اس علاقہ سے تاکہ نکال دیں آپ کو یہاں سے اور (اگر انہوں نے یہ حماقت کی) تب وہ نہیں ٹھہریں گے (یہاں) آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ۔''

اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مدنی ہے، جیسا کہ سورت کے آغاز میں بیان ہو چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ میں قیام فرما ہونے کے ساتھ حسد کیا اور کہا: بے شک انبیاء علیہم السلام شام بھیجے گئے ہیں، پس اگر آپ نبی ہیں تو آپ بھی وہاں چلے جائیں، کیونکہ اگر آپ نے اس کی طرف خروج کیا تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے اور آپ کے ساتھ ایمان لے آئیں گے، پس یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں راسخ ہوگئی کیونکہ آپ ان کے اسلام لانے کو پسند کرتے تھے، چنانچہ آپ نے مدینہ طیبہ سے ایک مرحلہ (منزل) تک سفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور عبدالرحمن بن غنم نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک پر تشریف لے گئے آپ صرف شام کا ارادہ رکھتے تھے، پس جب آپ تبوک اترے تو یہ ارشاد وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ سورت کے ختم ہونے کے بعد نازل ہوا، اور آپ کو واپس لوٹنے کا حکم دیا گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت اہل مکہ کے آپ کو نکالنے کے ارادہ کے بارے نازل ہوئی، اور اگر انہوں نے آپ کو نکال دیا تو پھر انہیں مہلت نہیں دی جائے گی، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کا حکم ارشاد فرمایا تو آپ وہاں سے نکل آئے، یہ قول اصح ہے، کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور اس لئے بھی کہ اس آیت کا ماقبل اہل مکہ کے بارے خبر ہے، اور یہ یہودیوں کا ذکر جاری نہیں۔

اور قولہ تعالیٰ مِنَ الْاَرْضِ سے مراد مکہ مکرمہ کی زمین ہے، جیسا کہ یہ قول ہے: فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ (یوسف:80) (سو میں تو نہیں چھوڑوں گا اس زمین کو۔) اس میں مراد ارض مصر ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے: وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْۤ اَخْرَجَتْكَ (محمد:13) (اور بہت سی ایسی بستیاں تھیں جو قوت و شوکت میں تمہاری اس بستی سے کہیں زیادہ تھیں جس (کے باشندوں نے) آپ کو نکال دیا) اس میں قریہ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس کا معنی ہے: اس کے باسیوں نے آپ کو نکالنے کا ارادہ کیا، اسی وجہ سے اضافت اس کی طرف کی اور فرمایا اَخْرَجَتْكَ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تمام کفار نے یہ قصد کیا کہ وہ آپ پر غلبہ پا کر آپ کو حقارت اور رسوائی کے ساتھ سرزمین عرب سے نکال دیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی (اور آپ کو روک لیا) اور اگر وہ آپ کو عرب میں زمین سے نکال دیتے تو پھر انہیں مہلت نہ دی جاتی، اور یہی معنی اس قول باری تعالیٰ کا ہے: وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا (اور (اگر انہوں نے یہ حماقت کی) تب وہ نہیں ٹھہریں گے (یہاں) آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ)۔ حضرت عطا ابن ابی رباح نے لَا يَلْبَثُوْنَ کو با مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ خَلْفَكَ حضرت نافع، ابن کثیر، ابوبکر، اور ابو عمرو رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اس کا معنی ہے بعدك (یعنی آپ کے بعد وہ یہاں نہیں ٹھہریں گے مگر تھوڑا عرصہ)۔ اور ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی نے خلافك پڑھا ہے (1) اور ابو حاتم نے اسے اختیار کیا ہے، اور انہوں نے اس قول پر قیاس کیا ہے: فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (التوبہ:81) (خوش ہو گئے پیچھے چھوڑے جانے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 476

والے اپنے (گھر) بیٹھے رہنے پر اللہ کے رسول کی (جہاد پر) روانگی کے بعد۔ اور اس کا معنی بھی بعدت ہے۔
جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

عَفَت الدیار خلافهم فکأنما　بسط الشَّواطِبُ بینهن حَصِیرا(1)

اس میں خلافهم، بعدهم (ان کے بعد) کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

ماوردی میں بسط البواسط ہے۔ کہا جاتا ہے: شطبت المرأة الجريد جب عورت ٹہنیاں چیرے تا کہ ان سے چٹائیاں بنائے۔ ابوعبید نے کہا ہے: پھر چیرنے والی اسے صاف کی ہوئی ٹہنیوں میں پھینک دیتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ خِلفَتَ بمعنی بعدتَ (آپ کے بعد) ہے۔ اور خِلفَكَ بمعنی مخالفتك (آپ کی مخالفت میں) ہے؛ اسے ابن انباری نے ذکر کیا ہے۔ اِلَّا قَلِیۡلًا اس میں دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے ... کہ اس مدت سے مراد وہ ہے جتنی مدت وہ آپ کو نکالنے کے بعد سے لے کر بدر کے دن اپنے قتل ہونے تک وہاں ٹھہرے رہے، اور یہ ان کا قول ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ یہاں مراد قریش ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے　کہ اس کے درمیان اور بنی قریظہ کے قتل اور بنی نضیر کے جلاوطن ہونے کے درمیان جو مدت ہے وہ مراد ہے، اور یہ ان کا قول ہے جنہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ مراد یہودی ہیں (2)۔

سُنَّةَ مَنۡ قَدۡ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ مِنۡ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحۡوِیۡلًا ۝

"(یہی ہمارا) دستور ہے ان کے بارے میں جنہیں ہم نے بھیجا آپ سے پہلے رسول بنا کر اور آپ نہیں پائیں گے ہمارے اس دستور میں کوئی ردوبدل۔"

قولہ تعالیٰ: سُنَّةَ مَنۡ قَدۡ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ مِنۡ رُّسُلِنَا یعنی یہ عذاب دیئے جائیں گے جیسا کہ ان کے بارے ہمارا دستور ہے جنہیں ہم نے بھیجا، پس یعذبون کو مضمر کر کے سُنَّةَ کو نصب دی گئی ہے، پس جب جر دینے والا حرف (کاف، کسنة میں) ساقط ہو گیا تو فعل نے عمل کیا، یہ فراء نے کہا ہے (3)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس معنی کی وجہ سے منصوب ہے سننا سنة من قد أرسلنا (ہم نے ان کے لئے دستور بنا رکھا ہے جنہیں ہم نے بھیجا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: کہ یہ کاف کے حذف کی تقدیر پر منصوب ہے؛ تقدیر کلام ہوگی: لا یلبثون خلفك إلا قليلا كسنة من قد أرسلنا (وہ نہیں ٹھہریں گے آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ جیسا کہ ان کے بارے ہمارا دستور ہے جنہیں ہم نے بھیجا)۔ پس اس تقدیر پر وقف اِلَّا قَلِیۡلًا پر نہیں کیا جائے گا اور پہلے اور دوسرے قول کے مطابق وقف کیا جائے گا۔ قَبۡلَكَ مِنۡ رُّسُلِنَا اس میں وقف اچھا ہے۔ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحۡوِیۡلًا یعنی اس دستور اور وعدے میں کوئی خلاف اور ردوبدل نہیں ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا ۝

"نماز ادا کیا کریں سورج ڈھلنے کے بعد رات کے تاریک ہونے تک (نیز ادا کیجئے) نماز صبح، بلاشبہ نماز صبح کا

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 261　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 262-261　3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 477

مشاہدہ کیا جاتا ہے"۔

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ جب مشرکین کے مکروفریب کو ذکر کر چکے تو ساتھ ہی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کرنے اور نماز کی محافظت کا حکم ارشاد فرمایا، اور اس میں دشمنوں کے خلاف مدد و نصرت کی طلب موجود ہے۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ يَضِيۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا يَقُوۡلُوۡنَ ۙ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ كُنۡ مِّنَ السّٰجِدِيۡنَ (الحجر) (اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کیا کرتے تھے سو آپ پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اور ہو جایئے سجدہ کرنے والوں سے) اور اقامۃ الصلوٰۃ کے بارے میں بحث سورۃ البقرہ کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ اور باجماع مفسرین یہ آیت فرض نمازوں کی طرف اشارہ ہے۔ علماء نے دلوک کے معنی میں دو مختلف قول بیان کئے ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد آسمان کے درمیان سے سورج کا ڈھل جانا، زوال پذیر ہو جانا ہے؛ یہ حضرت عمر، آپ کے صاحبزادے، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ان کے سوا علماء تابعین وغیرہ کی ایک جماعت نے کہا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ دلوک سے مراد سورج کا غروب ہونا ہے؛ یہ حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ ماوردی نے کہا ہے(1): جنہوں نے دلوک کو سورج کے غروب ہونے کا نام قرار دیا ہے وہ اس لئے ہے کیونکہ انسان سورج کے غروب ہونے کی حالت میں اس کے بالکل ظاہر اور بین ہونے کی وجہ سے اپنی آنکھوں کو اپنی ہتھیلی کے ساتھ رگڑتا ہے، اور جنہوں نے اسے سورج کے زوال کا نام دیا ہے تو وہ اس لئے کیونکہ وہ سورج کی شعاؤں کی شدت اور تیزی کی وجہ سے اپنی آنکھوں کو رگڑتا ہے(2)۔

اور ابوعبید نے کہا ہے: سورج کے دلوک کا معنی اس کا غروب ہونا ہے۔ اور دَلَكَتْ بَرَاحِ کا معنی ہے سورج غروب ہو گیا۔ جیسا کہ قطرب نے کہا ہے:

هذا مُقامُ قدمی رَباحِ ذَبَّبَ حتی دَلَكَتْ بَراحِ (3)

اس میں براح (با کے فتحہ کے ساتھ) حذام، قطام اور رقاش کے وزن پر ہے اور یہ سورج کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اور فراء نے اسے (با کے کسرہ کے ساتھ) پڑھا ہے اور یہ راحۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی ہتھیلی ہے، یعنی وہ غائب ہو گئی حالانکہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نے اپنی ہتھیلی اپنی بھنوؤں پر رکھ لی۔

اور اسی سے عجاج کا قول بھی ہے:

والشمس قد كادت تكون دَنَفًا أدفعها بالراح کی تَزَحْلَفَا(4)

ابن الاعرابی نے کہا ہے: الزُّحلوفة سے مراد ملائم کرنے کی جگہ ہے، (یعنی ڈھلوان کی جگہ)، کیونکہ وہ اس میں لڑھکتے

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1219
2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 263
3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 477
4۔ ایضاً

اور پھسلتے ہیں۔ مزید کہا: الزّحلفة دحرجة کی طرح ہے اور الدفع کی طرح، (یعنی لڑھکنا اور دھکا دینا)، کہا جاتا ہے: زحلفتُه فتزحلَف (میں نے اسے دھکا دیا پس وہ پھسل گیا، لڑھک گیا۔) اور کہا جاتا ہے: دَلَکَتْ الشَّمْسُ جب سورج غروب ہو جائے۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

مصابیح لیست باللواتی تقودها نجومٌ ولا بالآفلات الدوالِكِ(1)

ابن عطیہ نے کہا ہے: دلوک کا لغوی معنی مائل ہونا، جھکنا اور ڈھلنا ہے پس دلوک کی ابتدا سورج کا زوال پذیر ہونا ہے اور اس کی انتہا اس کا غروب ہونا ہے۔ اور زوال کے وقت سے لے کر غروب ہونے تک کے وقت کو دلوک کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ ڈھلنے اور جھکنے کی حالت میں ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان نمازوں کا ذکر کیا ہے جو دلوک کی حالت اور اس کے قریب ہوتی ہیں، پس اس میں ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں داخل ہیں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ مغرب کی نماز غسق اللیل میں داخل ہو(2)۔ اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ ظہر کا وقت زوال سے لے کر غروب آفتاب تک پھیلا ہوتا ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس کے واجب ہونے کو دلوک پر معلق کیا ہے، اور یہ سارے کا سارا دلوک ہی ہے، اور یہ امام اوزاعی اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے تفصیل میں کہا ہے۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حالت ضرورت میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے(3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ دلوک الشمس سے مراد سورج کا ڈھلنا ہے، اور غسق اللیل سے مراد رات کا جمع ہونا اور اس کا تاریک ہونا ہے(4)۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: الغسق سے مراد رات کی سیاہی ہے۔

جیسا کہ ابن قیس رقیات نے کہا ہے:

إن هذا الليل قد غَسَقَا واشتكيْتُ الهَمَّ والأَرَقَا(5)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: غسق اللیل سے مراد شفق کا غروب ہونا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد رات کی تاریکی کا آنا ہے۔

جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

ظلت تجود يداها وهي لاهية حتى إذا جنح الإظلام والغسق

کہا جاتا ہے: غسق اللیل غسوقًا۔ اور الغَسَق یہ اسم سین کے فتحہ کے ساتھ ہے۔ اور کلمہ کی اصل السیلان سے ہے۔ (یعنی اس کا معنی بہنا ہے)۔ کہا جاتا ہے: غسقت العین جب چشمہ بہہ پڑے، تَغْسِق۔ اور غَسَقَ الجرح غَسَقَانًا، یعنی زخم سے زرد پانی بہنے لگا۔ اور اغسق المؤذن یعنی مؤذن نے مغرب کو رات آنے تک مؤخر کر دیا۔ اور فراء نے بیان کیا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 477 2۔ ایضاً 3۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1221

4۔ مؤطا امام مالک، باب وقوت الصلوٰۃ، ما جاء فی دلوک الشمس، صفحہ 7 5۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 263

غسق اللیل و أغسق، ظلم و أظلم، دجا و أدجی، غبس و أغبس، غبش و أغبش (ان تمام میں رات کے آنے اور اس کے تاریک ہونے کا معنی پایا جاتا ہے)۔ اور ربیع بن خثیم بادل کے دن اپنے مؤذن کو فرماتے ہیں: أغسق أغسق۔ وہ کہتے: مغرب کو مؤخر کر دو یہاں تک کہ رات کی تاریکی چھا جائے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے مغرب کے آخری وقت میں اختلاف کیا ہے، پس کہا گیا ہے: اس کا وقت ایک ہی وقت ہے اور اس کا وقت نہیں ہے مگر اس وقت جب سورج غروب ہو جاتا ہے، اور یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی امامت میں بالکل بین اور واضح ہے، کیونکہ آپ نے یہ نماز دو دن ایک ہی وقت میں پڑھائی اور وہ غروب آفتاب کا وقت تھا، اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ان کے اصحاب کے نزدیک ظاہر مذہب ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے اور آپ سے مشہور بھی ہے، اور اسی طرح ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں کہا ہے: پس جب شفق غائب ہو جائے تو مغرب کا وقت نکل جاتا ہے اور عشاء کا وقت داخل ہو جاتا ہے (1)۔ اور اسی طرح ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، حسن بن حی، احمد، اسحاق، ابو ثور، اور داؤد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے، کیونکہ غروب سے لے کر شفق تک کا وقت سارے کا سارا غسق ہے۔ اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے وقت کے بارے سوال کرنے والے کو دوسرے دن مغرب کی نماز پڑھائی اور اسے موخر کیا یہاں تک کہ وہ شفق غروب ہونے کے قریب تھی (2)؛ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے: یہ حدیث امامت جبرائیل علیہ السلام کی اخبار سے اولیٰ ہے، کیونکہ یہ حدیث متاخر ہے کیونکہ یہ واقعہ مدینہ طیبہ میں پیش آیا اور جبرائیل علیہ السلام نے امامت مکہ مکرمہ میں کرائی، اور آپ کے فعل اور امر میں سے متاخر اولیٰ ہے، کیونکہ وہ اپنے ماقبل کے لئے ناسخ ہے۔ اور ابن عربی نے خیال کیا ہے کہ یہی قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب سے مشہور ہے، اور آپ کا وہ قول جو آپ کی موطا میں ہے آپ نے وہ طویل عمر تک پڑھایا اور اپنی زندگی میں اسے املاء کروایا۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ وہ احکام جو اسماء سے متعلق ہوتے ہیں کیا وہ ان کے اوائل سے متعلق ہوتے ہیں یا ان کے آخر سے یا پھر حکم ان تمام سے متعلق ہوتا ہے؟ تو نظر و فکر میں اقویٰ یہی ہے کہ حکم کا تعلق ان کے اوائل سے ہوتا ہے تاکہ اس کا ذکر لغو نہ ہو جائے پس جب حکم ان کے اوائل سے مربوط ہو جائے تو پھر اس کے بعد اس کا تعلق تمام کے ساتھ آخر تک جاری رہے گا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جس قول میں وسعت ہے وہ راجح ہے۔ تحقیق امام حافظ ابو محمد عبد الغنی بن سعید نے اجلح بن عبد اللہ کندی کی حدیث بیان کی ہے، انہوں نے ابو زبیر سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اسے نقل کیا ہے، آپ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے سورج غروب ہونے کے قریب نکلے اور آپ نے مغرب کی نماز ادا نہ فرمائی یہاں تک کہ آپ مقام سرف پر آ گئے۔ اور وہ نو میل سفر ہے۔ اور رہا نسخ کے بارے قول تو وہ بین اور واضح نہیں ہے اگرچہ تاریخ معلوم ہے، کیونکہ ان روایات میں تطبیق اور انہیں جمع کرنا ممکن ہے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: مغرب کے وقت کے بارے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کی احادیث کو افضلیت پر محمول کیا جائے گا، اسی وجہ سے امت نے سورج غروب ہونے کے

1۔ موطا امام مالک، صفحہ 8

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب اوقات صلوٰۃ الخمس، جلد 1، صفحہ 223

وقت اس میں تعجیل کرنے اور اسے فوراً ادا کرنے پر اتفاق کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ہم مسلمانوں میں سے کسی کو بھی نہیں جانتے جس نے جماعت والی مسجد میں غروب آفتاب کے وقت سے مغرب کی اقامت کو موخر کیا ہو۔ اور وسعت والی احادیث جواز کے وقت کو ظاہر کرتی ہیں، پس اس طرح تعارض ختم ہو جاتا ہے اور ان کو جمع کرنا صحیح ہوتا ہے، اور باتفاق اصولیین یہ ترجیح سے اولی ہے، کیونکہ اس میں دو دلیلوں میں سے ہر ایک پر عمل کرنا ثابت ہوتا ہے اور ترجیح یا نسخ کے قول میں ایک کو ساقط کرنا لازم آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ اس میں قُرْاٰنَ دو وجہوں سے منصوب ہے: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ الصلوٰۃ پر معطوف ہو، اس کا معنی ہوگا: أقم قرآن الفجر یعنی صبح کی نماز قائم کرنا، یہ فراء نے کہا ہے۔ اور اہل بصرہ نے کہا ہے: یہ اغراء کی بنا پر منصوب ہے، یعنی فعلیك بقرآن الفجر (تجھ پر صبح کی نماز لازم ہے)؛ یہ زجاج نے کہا ہے۔ خاص کر اس نماز کو قرآن سے تعبیر کیا گیا ہے دوسری نمازوں کو نہیں، کیونکہ قرآن ان سے عظمت وشان والا ہے، جبکہ صبح کی نماز کی قرأت طویل اور بالجہر ہے جیسا کہ یہ مشہور بھی ہے اور لکھی ہوئی بھی؛ یہ بھی زجاج سے مروی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: صبح کی نماز میں قرأت کو طویل کرنے کے مستحب ہونے پر اہل مدینہ کا پختہ عمل ہے اتنی مقدار تک جو پیچھے کھڑے ہونے والوں کے لئے تکلیف دہ نہ ہو۔ وہ اس میں طوال مفصل پڑھتے ہیں، اور ظہر اور جمعہ کی نمازوں کو بھی اس میں اس کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اور مغرب کی نماز میں قرأت میں تخفیف کرتے ہیں اور عصر اور عشاء میں متوسط قرأت کرتے ہیں۔ اور عصر کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ اس میں بھی مغرب کی طرح تخفیف کی جائے گی۔ اور جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے جو صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ ان نمازوں میں قرأت طویل کرنا جن میں مختصر قرأت پر استقرار ہے، اور ان نمازوں میں قرأت مختصر کرنا جن میں طویل قرأت کرنے پر عمل ہے، جیسا کہ فجر کی نماز میں معوذتین پڑھنا (1) جیسا کہ اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور مغرب کی نماز میں سورۂ اعراف، مرسلات اور طور کی قرأت کرنا، پس اس پر عمل متروک ہے اور اس وجہ سے بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو قرأت طویل کرنے سے منع کیا تھا جس وقت آپ نے اپنی قوم کو عشاء کی نماز کی امامت کرائی اور اس میں سورۃ البقرہ پڑھی، اسے صحیح نے روایت کیا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ آپ نے ائمہ کو تخفیف کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ فرمایا: ''اے لوگو! بے شک تم میں سے بھگانے والے بھی ہیں پس تم میں سے جو کوئی لوگوں کی امامت کرائے تو اسے چاہئے کہ وہ تخفیف کرے کیونکہ ان میں بچے بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے بھی، مریض بھی ہوتے ہیں اور درد والے بیمار بھی، اور ضعیف اور کمزور بھی ہوتے ہیں اور صاحب حاجت بھی (2)''۔ اور فرمایا: ''پس جب تم میں سے کوئی اکیلے نماز پڑھے تو وہ جتنی چاہے لمبی اور طویل پڑھے (3)''۔ یہ سب صحیح حدیث میں لکھا ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ یہ اس پر دلیل ہے کہ کوئی نماز بغیر قرأت کے نہیں ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

1۔ سنن نسائی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 151

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، اذا صلی لنفسہ فلیطول ماشاء، جلد 1، صفحہ 98 3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 97، مفہوم

نماز کو قرآن کا نام دیا ہے۔ علماء نے نماز میں قرأت کے بارے اختلاف کیا ہے پس جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ امام کے لئے اور اکیلے نماز پڑھنے والے کے لئے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔ اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے۔ اور آپ سے یہ بھی روایت ہے کہ نماز کے بڑے حصے میں اس کی قرأت واجب ہے، اور یہ اسحاق کا قول ہے۔ اور آپ سے یہ بھی ہے کہ ایک رکعت میں اس کی قرأت واجب ہے؛ یہ مغیرہ اور سحنون نے کہا ہے۔ اور ان سے یہ بھی ہے کہ نماز میں سے کسی شے میں قرأت واجب نہیں ہوتی۔ اور یہ آپ سے انتہائی شاذ روایات میں سے ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ قرأت نصف نماز میں واجب ہوتی ہے، اور اسی طرف امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ بھی گئے ہیں۔ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اور ایوب سے بھی روایت ہے کہ امام پر، اکیلے نماز پڑھنے والے پر اور مقتدی پر ہر حال میں قرأت واجب ہوتی ہے۔ اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قولوں میں سے ایک ہے، مکمل بحث سورۂ فاتحہ میں گزر چکی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: كَانَ مَشْهُوْدًا ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا کے بارے میں فرمایا: ''اس نماز میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں (1)''۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اسے علی بن مسہر نے اعمش سے انہوں نے ابو صالح سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جماعت کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز کی فضیلت اکیلے آدمی کی نماز پر پچیس درجے ہے اور صبح کی نماز میں رات کے ملائکہ اور دن کے ملائکہ جمع ہو جاتے ہیں (2)''۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: وَ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (3) اسی وجہ سے اس نماز کو جلدی (صبح سویرے) پڑھا جاتا ہے، پس جس نے یہ نماز سویرے نہ پڑھی تو اس کی نماز میں ملائکہ کے دو گروہوں میں سے صرف ایک گروہ حاضر ہوگا۔ اور اس معنی کی بناء پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھنا افضل ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اندھیرے اور روشنی کو جمع کرنا (یعنی ان کے درمیان پڑھنا) افضل ہے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر روشن کر کے پڑھنا اندھیرے میں پڑھنے سے افضل ہے اور یہ اس کے مخالف ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تغلیس پر مداومت اختیار کرتے تھے، اور یہ بھی کہ اس میں رات کے ملائکہ کی حاضری کو بھی فوت کرنا لازم آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 7۔ بعض علماء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے اس پر استدلال کیا ہے: ''اس میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں (4)''۔ کہ صبح کی نماز نہ رات کی نماز میں سے ہے اور نہ دن کی نماز میں سے۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 141۔ ایضاً، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3060، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، فضل صلوٰۃ الفجر فی الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 90 3۔ ایضاً

4۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 141

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عصر کی نماز بھی نہ رات کی نماز میں سے ہو اور نہ دن کی نماز میں سے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح روایت میں مروی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں: ''تم میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں، پس وہ عصر کی نماز میں اور فجر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں (1)''۔ الحدیث۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ عصر کی نماز دن میں سے ہے پس اسی طرح فجر کی نماز رات کی نماز میں سے ہوگی اور یہ اس طرح نہیں ہے، بلاشبہ یہ عصر کی نماز کی طرح دن کی نمازوں میں سے ہی ہے اور اس کی دلیل روزہ اور قسم وغیرہ ہے، اور یہ بالکل واضح ہے۔

وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝

''اور رات کے بعض حصہ میں (اٹھو) اور نماز تہجد ادا کرو (تلاوت قرآن کے ساتھ) (یہ نماز) زائد ہے آپ کے لئے یقیناً فائز فرمائے گا آپ کو آپ کا رب مقام محمود پر۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ مِنَ الَّیْلِ یہ مِنْ تبعیض کے لئے ہے۔ اور فَتَهَجَّدْ میں فا مضمر کلام پر عطف کے لئے ہے ای قم فتهجد (یعنی اٹھو اور نماز تہجد ادا کرو) بِهٖ یعنی تلاوت قرآن کریم کے ساتھ۔ اور التهجد هجود سے ہے اور یہ اضداد میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے: هجد بمعنی نام (وہ سو گیا) اور هجد بمعنی سهر (وہ جاگ گیا)، تو یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

أَلا زارَتْ و أَهلُ مِنًى هجود وليت خيالها بِمِنًى يعود

اور دوسرا کہتا ہے:

أَلَا طرقتنا والرفاق هجود فباتت بِعِلّات النوال تجود (2)

مراد نیام (سونا) ہے۔ اور هجد اور تهجد دونوں ہم معنی ہیں۔ اور هجدته أي أنمته (میں نے اسے سلا دیا)، اور هجدته اي أيقظته (میں نے اسے جگا دیا) اور التهجد سے مراد سونے کے بعد جاگنا ہے، اور پھر یہ نماز کا نام ہو گیا ہے، کیونکہ آدمی اس نماز کے لئے نیند سے بیدار ہوتا ہے، پس تهجد کا معنی نیند سے بیدار ہو کر نماز کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ اس کا یہ معنی اسود، علقمہ اور عبد الرحمن بن اسود رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور اسماعیل بن اسحاق قاضی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت حجاج بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ جب اس نے ساری رات قیام کیا تو اس نے تہجد ادا کر لیے! بلاشبہ تہجد وہ نماز ہے جو نیند کے بعد ہو''۔ پھر فرمایا: ''وہ نماز

1۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ، فضل صلوٰۃ الفجر والعصر والمحافظة عليها، جلد 1، صفحہ 227

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 478

ہے جو نیند کے بعد ہو"۔ پھر فرمایا: "وہ ہے جو سونے کے بعد ہو"۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی نماز ہوتی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الهجود کا معنی النوم (سونا) ہے۔ کہا جاتا ہے: تهجد الرجل جب آدمی نیند سے بیدار ہو، اور القی الهجود وهو النوم وہ اپنی نیند پھینک دے، دور کردے۔ اور وہ آدمی جو نماز کے لئے اٹھا اسے متهجد کا نام دیا جائے گا؛ کیونکہ متهجد وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ سے اپنی نیند کو دور پھینک دیتا ہے۔ اور یہ فعل تحوب (گناہ سے بچنا)، تحرج (گناہ سے بچنا) تأثم، تحنث (گناہ سے نفرت کرنا، اسے چھوڑ دینا) تقذر اور تنجس (نجاست اور پلیدی سے بچنا) کے قائم مقام ہے جب آدمی انہیں اپنے آپ سے دور کردے، پھینک دے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ (الواقعہ)

اس کا معنی ہے تندمون (کئے پر پشیمان ہونا)، یعنی تم اپنے آپ سے فکاہت پھینک دو گے، دور کردو گے اور اس سے مراد نفوس کا انتہائی فرحت و سرور میں ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے: رجل فكه جب آدمی بہت زیادہ خوش اور ہنسنے والا ہو۔ اور آیت میں اس کا معنی ہے: ووقتا من الليل أسهرته في صلاة وقراءة (اور رات میں کچھ وقت ہو جو اس کو نماز و قرأت کے لئے بیدار کرے)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: نَافِلَةً لَّكَ یعنی یہ آپ کے لئے اعزاز ہے؛ یہ مقاتل نے کہا ہے۔ اور علماء نے حضور نبی مکرم ﷺ کی امت کو چھوڑ کر خاص طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر کرنے میں اختلاف کیا ہے، پس کہا گیا ہے کہ رات کی نماز آپ ﷺ پر فرض تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نَافِلَةً لَّكَ یعنی یہ زائد فریضہ ہے اس فریضہ سے جو امت پر لازم کیا گیا ہے (1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس تاویل میں دو اعتبار سے بعد ہے: ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ فرض کو نفل کا نام دیا گیا ہے، اور یہ مجاز ہے حقیقت نہیں ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے ... کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "پانچ نمازیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کی ہیں۔" اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هن خمس وهن خمسون لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (یہ پانچ ہیں (دراصل) یہ پچاس ہیں میرے نزدیک قول تبدیل نہیں کیا جائے گا)۔ اور یہ نص ہے، تو پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ پر پانچ سے کوئی زائد نماز فرض ہوئی، یہ وہ ہے جو صحیح نہیں ہو سکتا، اگرچہ حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے: "تین چیزیں ہیں جو مجھ پر فرض ہیں اور میری امت کے لئے نفل ہیں رات کا قیام، وتر، اور مسواک کرنا (2)"۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رات کی نماز آپ کے لئے بھی نفل ہے اور ابتدا میں یہ تمام پر واجب تھی، پھر وجوب منسوخ ہو گیا اور رات کا قیام فرض ہونے کے بعد نفل ہو گیا، جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا، اس کا مفصل بیان سورۃ المزمل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور اس بنا پر نفل کے بارے امر ندب کے معنی میں ہوگا اور خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہو رہا ہے کیونکہ آپ کی مغفرت فرما دی گئی ہے (یعنی آپ معصوم ہیں) پس آپ وہ نفل ادا کریں گے جو آپ پر واجب نہیں ہیں تو وہ آپ کے لئے درجات میں اضافہ اور بلندی کا باعث ہوں گے اور آپ کے علاوہ امت کا نفل ادا کرنا فرائض میں واقع ہونے والے خلل کا تدارک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 478، مفہوم 2۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 406، حدیث 19540، بتغیر یسیر

اور کفارہ ہوتے ہیں؛ اس کا یہ معنی حضرت مجاہد وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ عطیہ ہے، کیونکہ کوئی بندہ سعادت میں سے عبادت کی توفیق سے افضل کوئی عطا نہیں پائے گا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا** مقام محمود کے بارے میں چار مختلف قول ہیں۔

(ا) اور یہی زیادہ صحیح ہے کہ یہ قیامت کے دن لوگوں کی شفاعت کا مقام ہے؛ یہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اور صحیح بخاری میں (1) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: بے شک لوگ قیامت کے دن گروہ گروہ ہو جائیں گے اور ہر امت اپنے نبی علیہ السلام کی اتباع کرے گی اور یہ کہے گی: اے فلاں! تو شفاعت کر، یہاں تک کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر شفاعت انتہا کو پہنچ جائے گی، پس اس دن اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر سرفراز فرمائے گا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ ہمیں حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا: ''جب قیامت کا دن ہو گا لوگ آپس میں بعض بعض سے اضطراب کا اظہار کریں گے اور پھر وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے کہیں گے: اپنی اولاد کی شفاعت کیجئے، تو آپ فرمائیں گے: میں یہ نہیں کر سکتا، لیکن تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں پھر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو آپ بھی فرمائیں گے: میں نہیں کر سکتا، البتہ تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ، کیونکہ وہ کلیم اللہ ہیں، چنانچہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور وہ بھی کہیں گے: نہیں میں شفاعت نہیں کر سکتا، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس چلے جاؤ کیونکہ وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں، چنانچہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو وہ بھی فرمائیں گے: میں اس کے لئے تیار نہیں البتہ تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ چنانچہ وہ میرے پاس آئیں گے تو میں کہوں گا: میں اس لئے تیار ہوں (2)''۔ آگے حدیث ذکر کی۔ اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ: **عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا** کے بارے فرمایا جب اس کے بارے پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ (مقام) شفاعت ہے (3)''۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ مقام محمود ہی اس شفاعت کا امر ہے جسے انبیاء علیہم السلام ایک دوسرے کے ذمہ لگائیں گے، یہاں تک کہ یہ امر ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک انتہا کو پہنچ جائے گا۔ پس آپ اہل موقف کی یہ شفاعت کریں گے تا کہ ان کا حساب جلدی میں ہو جائے اور وہ اپنے موقف (ٹھہرنے کا محل، میدان حشر) کے ہول اور خوف سے راحت اور سکون پالیں، اور یہ شفاعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، اور اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں (4)''۔ نقاش نے کہا ہے (5): رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تین شفاعتیں ہیں:

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 686
2۔ صحیح مسلم، اثبات الشفاعۃ واخراج الموحدین من النار، جلد 1، صفحہ 110
3۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3062، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
4۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 434، حدیث 32040
5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 479

شفاعت عامہ، جنت کی طرف سبقت لے جانے کی شفاعت، اور اہل کبائر کی شفاعت۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مشہور یہ ہے کہ یہ صرف دو شفاعتیں ہیں: شفاعت عامہ، جہنم سے گنہگاروں کو نکالنے کی شفاعت اور یہ دوسری شفاعت وہ ہے جسے انبیاء علیہم السلام دور نہیں ہٹائیں گے اور نہ ایک دوسرے پر ذمہ داری ڈالیں گے بلکہ وہ شفاعت کریں گے اور علماء بھی شفاعت کریں گے۔ اور قاضی ابو الفضل عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: قیامت کے دن ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعتیں پانچ ہیں! شفاعت عامہ، دوسری بغیر حساب کے قوم کو جنت میں داخل کرنے کے بارے، تیسری آپ کی امت کے موحدین کی ایک جماعت جنہوں نے اپنے گناہوں کے سبب جہنم واجب کر لی ہوگی پس ان کے بارے میں ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شفاعت کریں گے، اور اللہ تعالیٰ جس کے بارے چاہے گا کہ وہ شفاعت کریں اور وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اور یہی وہ شفاعت ہے جس کا مبتدع خوارج اور معتزلہ نے انکار کیا ہے، اور انہوں نے اس کا انکار اپنے فاسد اصولوں کی بنا پر کیا ہے، اور وہ استحقاق عقلی ہے جس پر کسی کو حسین اور قبیح قرار دینے کا دارومدار ہے اور چوتھی ان گنہگاروں کے بارے میں ہے جو جہنم میں داخل ہوں گے اور انہیں ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم السلام، ملائکہ اور ان کے مومن بھائیوں کی شفاعت سے باہر نکالا جائے گا۔ اور پانچویں شفاعت جنت میں اہل جنت کے درجات میں زیادتی اور ان کی بلندی کے بارے ہوگی۔ اور یہ وہ شفاعت ہے جس کا معتزلہ انکار نہیں کرتے اور نہ وہ حشر اوّل کی شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 5۔ حضرت قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا: سلف صالحین کا حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کی التجا کرنا اور ان کا اس میں رغبت رکھنا خبر مشہور اور مستفیض سے ثابت اور معلوم ہے، لہٰذا اس بنا پر اس کے قول کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا جس نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے میرا یہ دعا کرنا مکروہ ہے کہ وہ تجھے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت عطا فرمائے، کیونکہ یہ تو فقط گنہگاروں کے لئے ہوگی، اس لئے کہ یہ حساب میں تخفیف اور درجات اور مراتب میں زیادتی اور بلندی کے لئے بھی ہوگی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ پھر ہر عقلمند کوتاہیوں کا اعتراف کرتا ہے اور وہ معافی کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ اپنے عمل کے سبب سرکش اور حدود سے تجاوز کرنے والا نہیں ہوتا اور وہ اس سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں وہ ہلاک ہونے والوں میں سے نہ ہو جائے، اور مذکورہ قول کرنے والے کے قول سے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ مغفرت اور رحمت کی دعا ہی نہ مانگے کیونکہ یہ بھی گناہ کرنے والوں کے لئے ہے۔ اور یہ سب اس کے خلاف ہے جو کچھ سلف و خلف کی دعا سے معلوم ہوا ہے! امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جس کسی نے اذان سن کر یہ دعا پڑھی اَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلٰوةِ الْقَآئِمَةِ آتِ مُحَمَّدَانِ... صلی اللہ علیہ وسلم ..... الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَانِ الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ قیامت کے دن اس کے لئے میری شفاعت حلال ہوگئی (1)“۔

دوسرا قول یہ ہے ..... کہ مقام محمود سے مراد اللہ تعالیٰ کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قیامت کے دن لواء الحمد عطا کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس قول اور پہلے قول کے درمیان کوئی منافرت نہیں ہے، کیونکہ لواء الحمد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست

1۔ صحیح بخاری، الدعاء عند النداء، جلد 2، صفحہ 686

مبارک میں ہوگا اور آپ شفاعت کریں گے۔ ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور یہ میں فخر سے نہیں کہہ رہا اور میرے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا اور اس پر مجھے فخر نہیں اور اس دن آدم علیہ السلام اور ان کے سوا کوئی نبی نہ ہوگا مگر وہ میرے جھنڈے کے نیچے ہوگا(1)''۔ الحدیث۔

تیسرا قول یہ ہے اسے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جماعت سے بیان کیا ہے، اس میں سے حضرت مجاہد بھی ہیں، اس جماعت نے یہ کہا ہے کہ مقام محمود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ اپنی کرسی پر بٹھائے گا اور اس بارے میں انہوں نے ایک حدیث بھی روایت کی ہے۔ اور علامہ طبری نے اس کے جواز کو ایک قول کی زیادتی سے تقویت دی ہے۔ اور وہ نہیں نکل سکتا مگر معنی میں حیلہ اور انتہائی نرمی برتنے کے ساتھ، اور اس میں حقیقت سے بہت بعد اور دوری ہے۔ اور اس کے باوجود روایت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اور اس کے معنی میں تاویل ہوگی (2)۔ اور نقاش نے ابوداؤد سجستانی سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا: جس نے اس حدیث کا انکار کیا تو وہ ہمارے نزدیک متہم ہوگا، اہل علم اس کے بارے مسلسل بیان کرتے رہے ہیں، جس نے اس کی تاویل کی بنا پر اس کے جواز کا انکار کیا ہے(3)۔ ابوعمر نے کہا ہے: حضرت مجاہد اگرچہ ائمہ میں سے ایک ہیں آپ قرآن کریم کی تاویل کرتے ہیں کیونکہ آپ کے دو قول ہیں جو اہل علم کے نزدیک چھوڑ دیئے گئے ہیں: ان میں سے ایک یہی ہے۔ اور دوسرا اس قول باری تعالیٰ کی تاویل میں ہے: وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ (القیامۃ) فرمایا: وہ ثواب کا انتظار کرے گا، یہ نظر (یعنی رب کریم کو دیکھنے) سے نہیں ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن شہاب نے حدیث التنزیل کے باب میں اسے ذکر کیا ہے۔ اور حضرت مجاہد سے بھی اس آیت میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو عرش پر بٹھائے گا(4)۔ اور یہ تاویل محال نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام اشیاء اور عرش کو پیدا کرنے سے پہلے اپنی ذات کے ساتھ قائم اور موجود تھا، پھر اس نے بغیر حاجت اشیاء کو تخلیق فرمایا مگر اسے ان کی حاجت اور ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف اپنی قدرت اور حکمت کے اظہار کے لئے ایسا کیا، اور اس لئے تاکہ اس کا وجود، اس کی توحید، کمال قدرت اور تمام افعال محکمہ کے بارے اس کا علم معلوم ہو جائے، اور اس نے اپنے لئے عرش تخلیق فرمایا اور اپنی قدرت اور شان کے مطابق اس پر قرار پذیر ہوا بغیر اس کے کہ اللہ کریم نے اس کو مس کیا ہو، یا عرش اس کے لئے مکان بنا ہو۔ کہا گیا ہے: وہ اب بھی اسی صفت پر ہے جس پر وہ زمان و مکان کو پیدا کرنے سے پہلے تھا؛ پس اس بناء پر جواز میں یہ قول کرنا برابر ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش یا زمین پر بٹھایا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر قرار پذیر ہونا انتقال، زوال، احوال کا تبدیل ہونا مثلاً اٹھنا، بیٹھنا وغیرہ اور وہ حالت جو عرش کو مشغول کر دے، کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے عرش پر بلاکیف متمکن ہوا

1۔ جامع ترمذی، کتاب المناقب، ما جاء فی فضل النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 202
ایضاً، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3073، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 479
3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 168

جیسا کہ اس نے اپنے بارے میں خبر دی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش پر بٹھانا نہ تو آپ کے لئے صفت ربوبیت کو ثابت کرتا ہے اور نہ آپ کو صفت عبودیت سے نکالنے کا سبب ہے، بلکہ یہ تو آپ کے مقام ومحل کو بلند کرنا اور آپ کو اپنی مخلوق پر شرف وعزت عطا کرنا ہے۔ اور رہا اخبار میں آپ کا قول مَعَهٗ تو یہ اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کی طرح ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ (الاعراف:126) (بے شک جو مقرب ہیں تیرے رب کے) اور رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (التحریم:11) (اے میرے رب! بنا دے میرے لئے اپنے پاس ایک گھر جنت میں۔) اور وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (العنکبوت:69) (اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر وقت) محسنین کے ساتھ ہے) اور اسی طرح کے دیگر ارشادات۔ یہ تمام بلند رتبہ، اور درجہ کی طرف عائد ہیں نہ کہ مکان کی طرف۔

چوتھا قول یہ ہے کہ آپ کا اپنی شفاعت کے ساتھ جہنم سے انہیں نکالنا ہے جو نکلیں گے؛ یہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔ اسے مسلم نے ذکر کیا ہے۔ ہم نے اسے ''کتاب التذکرہ'' میں ذکر کیا ہے۔ واللہ الموفق۔

مسئلہ نمبر 6۔ رات کے قیام کے مقام محمود کا سبب ہونے کے بارے میں علماء کے دو مختلف قول ہیں:

ان میں سے ایک یہ ہے ... کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فعل میں سے جسے چاہے اپنے فضل کا سبب بنا دیتا ہے چاہے تو اس میں وجہ حکمت کی پہچان نہ کرائے، یا وجہ حکمت کی معرفت عطا کر دے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ رات کے وقت قیام کرنے میں لوگوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوت اختیار کرنا اور اس کی مناجات کرنا ہے، پس اس نے رات کے قیام میں اپنے ساتھ خلوت نشینی اور اپنی مناجات عطا فرما دی ہے اور یہی مقام محمود ہے اور اس میں مخلوق اپنے درجات کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فضیلت پاتی ہے اور مخلوق میں درجہ کے اعتبار سے سب سے اشرف واعلیٰ حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، کیونکہ آپ کو وہ کچھ عطا کیا جاتا ہے جو کسی کو عطا نہیں کیا جائے گا اور آپ اس وقت شفاعت کریں گے جب کوئی شفاعت نہیں کرے گا۔

اور عَسٰی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ واجب اور ثابت کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور مَقَامًا ظرف کی بنا پر منصوب ہے، یعنی بمعنی فی مقام أو إلى مقام۔ اور طبری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مقام محمود یہ وہی مقام ہے جس میں میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا(1)''۔ پس مقام وہ جگہ ہے جس میں انسان امور عظیمہ سرانجام دینے کے لئے کھڑا ہوتا ہے جیسا کہ وہ مقامات جو بادشاہوں کے سامنے ہوتے ہیں۔

وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝

''اور دعا مانگا کیجئے کہ اے میرے رب! جہاں کہیں تو مجھے لے جائے سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں کہیں سے مجھے لے آئے سچائی کے ساتھ لے آ اور عطا فرما مجھے اپنی جناب سے وہ قوت جو مدد کرنے والی ہو۔''

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 168

کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تو مجھے موت عطا فرما سچائی کی موت، اور مجھے قیامت کے دن اٹھا سچائی کے ساتھ، تا کہ یہ الله تعالیٰ کے اس قول سے متصل ہو جائے: عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا گویا جب آپ کے ساتھ اس کا وعدہ فرمایا تو آپ کو حکم دیا کہ دعا مانگا کریں تا کہ آپ کے لئے وعدہ پورا کر دیا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو مجھے ان امور میں داخل فرما دے جن کا حکم دیا گیا ہے اور ان سے مجھے نکال لے جن سے منع کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا کی تعلیم دی کہ آپ حالت نماز اور دیگر اوقات میں مشرکین کے درمیان سے نکالے جانے اور پرامن جگہ میں پہنچائے جانے کی دعا مانگا کیجئے، پس الله تعالیٰ نے آپ کو مکہ مکرمہ سے نکالا اور آپ کو مدینہ طیبہ پہنچا دیا۔ اس معنی کو ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تھے پھر آپ کو ہجرت کا حکم دیا گیا پس یہ آیت نازل ہوئی (1): وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: یہ آپ کا مکہ مکرمہ سے نکلنا اور فتح کے دن حالت امن میں مکہ مکرمہ میں داخل ہونا ہے۔ ابو سہل نے کہا ہے: جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو منافقین نے کہا تھا: لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (المنافقون: 8) (تو نکال دیں گے عزت والے وہاں سے ذلیلوں کو)۔ تو اس ارشاد میں مراد عزت کے ساتھ داخل کرنا اور مدد و نصرت کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف نکالنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تو مجھے اس امر میں سچائی کے ساتھ داخل فرما دے جس کے ساتھ تو نے مجھے عزت و تکریم عطا فرمائی ہے (اور وہ) نبوت ہے، اور مجھے اس سے سچائی کے ساتھ نکال لے جب تو مجھے موت عطا فرمائے)، اس کا یہ معنی حضرت مجاہد نے بیان کیا ہے۔ اور المُدخل اور المُخرج (میم کے ضمہ کے ساتھ) یہ بمعنی ادخال (داخل کرنا) اور اخراج (نکالنا) ہیں، جیسا کہ الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا (المومنون: 29) (اے میرے رب! اتار مجھے بابرکت منزل پر۔) یعنی یہ بمعنی انزال ہے میں اس جگہ میں ایسی شے نہ دیکھوں جو میں ناپسند کرتا ہوں اور یہی قرأت عامہ ہے۔ حسن، ابو العالیہ، اور نصر بن عاصم رحمہم اللہ تعالیٰ نے مَدخل اور مَخرج دونوں میموں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بمعنی دخول اور خروج ہیں (یعنی داخل ہونا اور نکلنا)، پس پہلا رباعی ہے اور یہ ثلاثی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مجھے موت کے وقت سچائی کے ساتھ قبر میں داخل فرما اور دوبارہ اٹھائے جانے کے وقت سچائی کے ساتھ وہاں سے نکال۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تو مجھے سچائی کے ساتھ لے جا جہاں کہیں تو مجھے لے جائے اور سچائی کے ساتھ وہاں سے لے آ، یعنی تو مجھے ان سے نہ بنا جو من وجہ داخل ہوتے ہیں اور من وجہ خارج ہوتے ہیں، کیونکہ دو چہروں والا تیرے نزدیک وجیہ اور پسندیدہ نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ہر اس کے بارے میں عام ہے جو امور میں پائے جاتے ہیں اور سفروں اور اعمال میں سے جن کا قصد کیا جاتا ہے، اور موت و حیات میں تقدیر کے جس تصرف کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ پس یہ ایک دعا ہے، اور اس کا معنی ہے: اے میرے رب! تمام امور میں میرے داخل ہونے اور ان سے نکلنے کے بارے میری اصلاح فرما۔ اور قول باری تعالیٰ: وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا شعبی

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب و من سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3064، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور عکرمہ نے کہا ہے سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا سے مراد حجۃ ثابتہ ہے۔ اور حسن اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد عزت، مدد و نصرت اور تمام دینوں پر آپ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ فرمایا: پس اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ فرمایا کہ وہ فارس اور روم وغیرہ کی سلطنتیں ان سے چھین لے گا اور اسے آپ کے حوالے کر دے گا۔

وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝۸۱

''اور آپ (اعلان) فرما دیجئے: آ گیا ہے حق اور مٹ گیا ہے باطل، بے شک باطل تھا ہی مٹنے والا۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ امام بخاری اور ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو اس وقت کعبہ معظمہ کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ کی چھڑی سے انہیں کچوکے دینے لگے...... اور کبھی فرمایا: بِعُوْدٍ (لکڑی سے مراد چھڑی ہی ہے) ... اور ساتھ فرماتے: جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (آ گیا ہے حق اور مٹ گیا ہے باطل بے شک باطل مٹنے والا ہی تھا) حق آ گیا ہے اور باطل کبھی نہیں آئے گا(1)''۔ یہ الفاظ ترمذی کے ہیں۔ اور انہوں نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اور اسی طرح مسلم کی حدیث میں نُصُبًا ہے۔ اور ایک روایت میں صنما ہے۔

ہمارے علماء نے کہا ہے: اس عدد کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک دن میں ایک بت کی تعظیم اور پرستش کرتے تھے اور ان کے بڑے (اور سردار) کو دو دنوں کے ساتھ خاص کرتے تھے۔ (یعنی اس کی پرستش دو دن کرتے تھے) اور آپ کا قول: **فجعل يطعنها بعود في يده**(2) کہا جاتا ہے: بے شک وہ کچ کے ساتھ مضبوط اور پختہ کھڑے کئے گئے تھے اور جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی بت کے چہرے پر چھڑی لگاتے تو وہ گدی کے بل پیچھے گر جاتا یا گدی پر مارتے تو وہ اپنے چہرے کے بل گر پڑتا۔ اور آپ فرمار ہے تھے: جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا اسے ابو عمر اور قاضی عیاض نے بیان کیا ہے۔ اور قشیری نے کہا ہے: کوئی بت باقی نہیں بچا مگر وہ اپنے منہ کے بل گر گیا، پھر آپ نے ان کے بارے حکم دیا تو وہ توڑ دیئے گئے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں مشرکین کے بتوں اور دیگر تمام بتوں کو توڑنے پر دلیل ہے جب ان پر غلبہ پالیا جائے۔ اور اس میں معنوی طور پر باطل کے تمام آلات کو توڑنا داخل ہے، اور ہر وہ شے جو صرف اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی کے لئے استعمال ہو مثلاً آلات موسیقی جیسے ستار، سارنگی اور وہ مزامیر جن کا سوائے لہو ولعب اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کرنے کے اور کوئی مقصد اور معنی نہیں۔ ابن منذر نے کہا ہے: أصنام کے معنی میں وہ صورتیں بھی ہیں جو مٹی، لکڑی اور ان کے مشابہ چیزوں سے بنائی جاتی ہیں، اور ہر وہ شے جسے لوگ بناتے ہیں اور ان میں سوائے اس لہو کے جس سے منع کیا گیا ہے اور کوئی منفعت نہ ہو۔ ان میں سے کسی شے کو بیچنا جائز نہیں سوائے ان بتوں کے جو سونے، چاندی، لوہے اور تانبے وغیرہ سے بنائے گئے ہوں،

1۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب و من سورۃ بنی اسرائیل، حدیث نمبر 3063، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ اسراء، جلد 2، صفحہ 686

جب انہیں موجودہ حالت سے تبدیل کر دیا جائے اور وہ پگھلا ہوا ٹکڑا یا کٹا ہوا ٹکڑا بن جائے تو پھر اس کو بیچنا اور اس کے عوض کوئی شے خریدنا جائز ہے۔ مہلب نے کہا ہے: باطل آلات میں سے جو توڑ دیئے جائیں اور انہیں توڑنے کے بعد روک کر محفوظ رکھنے میں منفعت اور فوائد ہوں تو پھر ان ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کا ان کا مالک ہی زیادہ حقدار ہے، مگر یہ کہ امام وقت مالی سزا دینے اور اس میں مزید سختی اور شدت کے لئے انہیں آگ کے ساتھ جلانا مناسب سمجھتا ہو، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے جلانے کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے گھروں کو جلانے کا ارادہ فرمایا جو نماز باجماعت سے پیچھے رہتے تھے (1)۔ اور یہی مالی سزا میں اصل اور بنیاد ہے، اس کے ساتھ ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اس اونٹنی کے بارے میں جس پر اس کی مالکہ نے لعنت کی ہو: ”تم اسے چھوڑ دو کیونکہ اس پر لعنت کی گئی ہے (2)“۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مالکہ کو ادب سکھانے کے لئے اس سے اس کی ملکیت ختم کر دی، اور یہ اس کے لئے اس قول کی سزا ہے جو اس نے اس کے خلاف کہا اس کے ساتھ جس کے ساتھ اس نے اسے پکارا۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس دودھ کو جو پانی کے ساتھ ملایا گیا، اس کے مالک پر بہا دیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ جو کچھ ہم نے آیت کی تفسیر میں سے ذکر کیا ہے اسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں دیکھا جا سکتا ہے: ”قسم بخدا! حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ایک عادل حاکم کی حیثیت سے اتریں گے اور ضرور صلیب کو توڑ دیں گے، اور خنزیر کو یقیناً قتل کریں گے اور ضرور جزیہ لگائیں گے اور یقیناً نوجوان اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی اور انہیں پکڑنے کی کوشش نہیں کی جائے گی“ (3) الحدیث۔ اسے صحیحین نے نقل کیا ہے۔ اور اسی باب سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پردے کو پھاڑنا بھی ہے جس پر تصویریں بنی ہوئی تھیں، اور یہ بھی تصویروں اور آلات ملاہی کو فاسد اور خراب و برباد کرنے پر دلیل ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، اور یہ سب ان کو بنانے سے روکتا ہے اور ان کے مالک پر انہیں تبدیل کرنے کو واجب قرار دیتا ہے۔ بے شک یہ صورتیں بنانے والوں کو (اور ان کے مالکوں کو) قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور ان کو کہا جائے گا: انہیں زندہ کرو جنہیں تم نے بنایا ہے اور تیرے لئے یہ کافی ہے، اور عنقریب اس کا بیان سورۃ النمل میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ یعنی اسلام آ گیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حق سے مراد قرآن کریم ہے، یہ حضرت مجاہد نے کہا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد جہاد ہے۔ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ کہا گیا ہے: باطل سے مراد شرک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد شیطان ہے؛ یہ حضرت مجاہد نے کہا ہے۔ اور درست یہ ہے کہ لفظ میں ممکنہ حد تک تعمیم ہے، پس تفسیر یہ ہوگی کہ شریعت آ گئی تمام احکام کے ساتھ جن کو وہ متضمن ہے۔ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اور باطل باطل ہو گیا۔ اور اسی سے زھوق النفس بھی ہے یعنی اس کا باطل ہونا۔ کہا جاتا ہے: زھقت نفسه تَزهَق زھوقا، وأزھقتها (اس کا نفس باطل ہو گیا، اور میں نے اسے باطل کر

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، وجوب صلوٰۃ الجماعۃ، جلد 1، صفحہ 89، مفہوم

2۔ سنن طبرانی الکبیر، جلد 18، صفحہ 190، حدیث 452

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، نزول عیسیٰ بن مریم، جلد 1، صفحہ 87

دیا)۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا یعنی اس کے لئے بقا نہیں ہے، اور حق وہ ہے جو ثابت ہوتا ہے۔

وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۙ وَ لَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝۸۲

''اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کے لئے اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کے لئے مگر خسارہ کو۔''

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ نُنَزِّلُ جمہور نے اسے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حضرت مجاہد نے وَیُنْزِلُ یا اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور اسے مروزی نے حفص سے روایت کیا ہے۔ اور مِنَ ابتداءِ غایت کے لئے ہے، اور صحیح یہ ہے کہ یہ بیان جنس کیلئے ہو، گویا کہ یہ فرمایا: وَ نُنَزِّلُ ما فیہ شِفَاءٌ مِنَ الْقُرْاٰنِ (اور ہم قرآن میں وہ نازل کرتے ہیں جو شفا ہے۔) اور حدیث میں ہے: ''جس نے قرآن کریم سے شفا طلب نہ کی تو اللہ تعالیٰ اسے شفا نہیں دے گا(1)''۔ اور بعض متاولین نے مِنَ کے تبعیضیہ ہونے کا انکار کیا ہے، کیونکہ یہ اس سے محفوظ ہے کہ اسے یہ لازم آئے کہ اس کے بعض میں شفا نہیں ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اسے یہ لازم نہیں آتا، بلکہ یہ صحیح ہے کہ مِنَ اس اعتبار سے تبعیض کے لئے ہو کہ اس کے نازل کرنے کو فقط بعض قرار دیا گیا ہے، تو گویا یہ فرمایا: وَ نُنَزِّلُ من القرآن شیئًا شِفَاءً (اور ہم قرآن میں سے کچھ چیزیں باعث شفا نازل کرتے ہیں)، نہ کہ اس تمام میں شفا ہے(2)۔

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے اس کے شفا ہونے میں دو مختلف قول بیان کئے ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ دلوں کے لئے ان سے جہالت دور کرنے، شک اور ریب کا ازالہ کرنے، اور معجزات اور وہ امور جو اللہ تعالیٰ پر دلالت کرتے ہیں انہیں سمجھنے کے لئے جہالت کے مرض سے دل کے پردے کھولنے کے اعتبار سے باعث شفا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ظاہری بیماریوں کے لئے دم اور تعوذ کے سبب باعث شفا ہے۔ تحقیق ائمہ نے روایت بیان کی ہے اور یہ الفاظ دارقطنی کے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تیس سواروں کے ایک سریہ میں بھیجا آپ نے بیان کیا: پس ہم عرب کی ایک قوم کے پاس اترے اور ہم نے ان سے پوچھا (کیا) وہ ہماری مہمان نوازی کریں گے؟ تو انہوں نے انکار کر دیا، فرمایا: پھر قبیلے کے سردار کو ڈس لیا گیا، پس وہ ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے: تم میں کوئی ہے جو بچھو کا دم کرتا ہو؟ اور ابن قتہ کی روایت میں ہے: بے شک بادشاہ مر رہا ہے۔ آپ نے فرمایا: میں نے کہا: ہاں میں ہوں، لیکن میں دم نہیں کروں گا یہاں تک کہ تم ہمیں کچھ دو، تو انہوں نے کہا: ہم تمہیں تیس بکریاں دیں گے۔ آپ نے فرمایا: پس میں نے اس پر سات مرتبہ(3) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پڑھ کر دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا۔ اور سلیمان بن قتہ عن ابی سعید رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: پس اسے افاقہ ہو گیا اور صحت یاب ہو گیا۔ تو اس نے ہماری طرف ضیافت کا کھانا بھی بھیجا اور بکریاں بھی ہماری طرف بھیجیں، پس ہم نے کھانا کھا لیا اور میرے ساتھیوں نے بکریوں میں سے

1۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 9، حدیث 28106 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 480 3۔ سنن دارقطنی، جلد 3، صفحہ 63، حدیث 243

کوئی کھانے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہو گئے اور آپ کو میں نے ساری خبر گوش گزار کر دی تو آپ نے فرمایا: "تجھے کس نے بتایا کہ یہ دم ہے۔" میں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! یہ ایک شے ہے جو میرے دل میں القا کر دی گئی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کلوا و أطعمونا من الغنم (1) (تم خود بھی کھاؤ اور بکریوں میں سے ہمیں بھی کھلاؤ)۔ انہوں نے اسے کتاب السنن میں نقل کیا ہے۔ اور (کتاب المدبح) میں سری بن یحییٰ کی حدیث سے ذکر کیا ہے انہوں نے کہا: مجھے معتمر بن سلیمان نے لیث بن ابی سلیم سے، انہوں نے حسن سے، اور انہوں نے ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے حکم سے برص، جنون، جذام، پیٹ چلنے، سل (پھیپھڑے کی بیماری، لاغری)، بخار اور سانس کی بیماری سے نفع اور فائدہ ہوتا ہے کہ تو زعفران یا سرخ مٹی (گیرو) کے ساتھ یہ کلمات لکھے أعوذ بكلمات الله التامة و أسمائه كلها عامة من شر السامة و العامة و من شر العين اللامة و من شر حاسد اذا حسد و من أبي فروة و ما ولد۔ اسی طرح کہا، اور من شر أبي قترة نہیں کہا۔ العین اللامہ سے مراد نظر بد کا لگنا ہے۔ تو کہتا ہے: میں اس کی پناہ مانگتا ہوں ہر زہریلے کیڑے سے اور نظر بد سے۔ اور رہا آپ کا یہ قول: أعيذه من حادثات اللمة تو کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد حوادثات زمانہ ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد شدت اور سختی ہے۔ اور السامة کا معنی الخاصہ ہے۔ کہا جاتا ہے: كيف السامة و العامة (خاص و عام کیسے ہیں) اور السامة سے مراد زہر بھی ہے۔ اور من فروة و ما ولد۔ اور فرمایا: تنتیس ملائکہ اپنے رب کریم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی: ہماری زمین میں درد اور بیماری ہے تو رب کریم نے فرمایا: اپنی زمین سے کچھ مٹی لے لو اور اپنی پیشانیوں پر مل لو۔ یہ فرمایا: تمہاری پیشانیوں کے لئے محمد ﷺ کا دم ہے، وہ کامیاب نہیں ہو گا جس نے اسے ہمیشہ چھپائے رکھا یا اس پر کوئی ہدیہ وغیرہ لیا۔" پھر فاتحة الكتاب (الحمد شریف) سورۃ البقرہ کی پہلی چار آیات، اور وہ آیت جس میں ہواؤں کے چلنے کا ذکر ہے، آیۃ الکرسی اور اس کے بعد والی دو آیتیں، سورۃ البقرہ کی آخری آیات لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ سے لے کر اس کے آخر تک، سورہ آل عمران کی پہلی دس آیتیں اور اس کے آخر سے دس آیتیں، سورۃ النساء کی پہلی آیت، سورۃ المائدہ کی پہلی آیت، سورۃ الانعام کی پہلی آیت، سورۃ الاعراف کی پہلی آیت، اور وہ آیت جو سورۃ الاعراف میں ہے۔ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ آیت کے آخر تک؛ اور وہ آیت جو سورۂ یونس میں ہے اس جگہ سے قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ اور وہ آیت جو سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝ اور سورۃ الصافات کی پہلی دس آیات، اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اور معوذتین لکھیں۔ یہ پاک صاف برتن میں لکھی جائیں گی پھر انہیں پاک پانی کے ساتھ تین بار دھویا جائے گا پھر اس سے تین بار درد والی جگہ پر لگائے پھر اس سے اس طرح وضو کرے جس طرح نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے اور وہ نماز کے لئے وضو کرنے سے پہلے اس سے وضو کرے، یہاں تک کہ اس سے وضو کرنے سے پہلے پاکیزگی اور طہارت کی حالت پر

1۔ سنن دار قطنی، جلد 3، صفحہ 64، حدیث 246

ہو پھر وہ اپنے سر، اپنے سینے اور اپنی پیٹھ پر پانی انڈیلے اور اس کے ساتھ استنجا نہ کرے پھر وہ دو رکعتیں (نفل نماز) پڑھے پھر اللہ تعالیٰ سے شفا کی دعا مانگے، اسی طرح تین دن تک عمل کرے، اتنی مقدار جتنا ہر روز لکھا جا سکتا ہو۔ اور ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں: ومن شئ ابی قترۃ وما ولد۔ اور فرمایا: ''پس اپنی پیشانیوں پر مل لو۔'' اور کوئی شک نہ کیا جائے۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس مرض میں آپ کا وصال ہوا اس میں معوذات پڑھ کر اپنے آپ پر پھونکتے تھے اور جب یہ ثقیل ہو گیا (یعنی بیماری بڑھ گئی) تو میں یہ پڑھ کر آپ پر پھونکتی تھی اور میں آپ کا اپنا دست مبارک برکت کے لئے پھیرتی تھی۔ پس میں (مراد عروہ بن زبیر ہیں) نے زہری سے پوچھا آپ کیسے پھونکتے تھے؟ تو انہوں نے بیان کیا: آپ اپنے ہاتھوں پر پھونک مارتے تھے پھر انہیں اپنے چہرے پر پھیر لیتے تھے (1)۔ اور مالک نے ابن شہاب سے انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب تکلیف ہوتی تو آپ اپنے اوپر معوذتین پڑھتے اور تھوکتے یا پھونک مارتے (2)۔ ابوبکر بن الانباری نے کہا ہے: علمائے لغت نے کہا ہے کہ نفث سے مراد ایسی پھونک مارنا ہے جس کے ساتھ تھوک نہ ہو۔ اور تفل کا معنی ایسی پھونک مارنا ہے جس کے ساتھ تھوک بھی ہو۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فإن یَبرأ فلم أنفِث علیه   وإن یُفقد فحقَّ له الفقود

اور ذوالرمہ نے کہا ہے:

و مِن جَوف ماءٍ عَرْمَض الحَولِ فوقه   متی یَحْسُ منه مائحُ القوم یَتْفَل

اس سے مراد تھوک کے ساتھ پھونک مارنا ہے۔ اور النفث کے بارے علماء نے جو کہا ہے اس کا بیان سورۃ الفلق میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت بیان کی ہے: یہ ایسی حدیث ہے جس کی مثل سے دین میں حجت پکڑنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس کے ناقلین میں وہ ہیں جو معروف نہیں۔ اور اگر صحیح بھی ہو تو پھر بھی یا غلط ہے یا منسوخ ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ الفاتحہ کے بارے فرمایا: ''تجھے کس نے بتایا کہ یہ دم ہے (3)؟'' اور جب معوذتین کے ساتھ دم کرنا جائز ہے اور یہ دونوں قرآن کریم کی سورتیں ہیں تو پھر سارا قرآن کریم جواز میں ان دونوں کی مثل ہے کیونکہ سارے کا سارا قرآن ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میری امت کی شفا تین چیزوں میں ہے، کتاب اللہ کی آیت میں، یا شہد چاٹنے میں، یا اچھی طرح پچھ لگوانے میں (4)''۔ اور رجا الغنوی نے کہا ہے: جس نے قرآن

1۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، الرقی بالقران والمعوذات، جلد 2، صفحہ 854

2۔ مؤطا امام مالک، التعوذ والرقیۃ من المرض، صفحہ 720

3۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، الرقی بالقرآن والمعوذات، جلد 3، صفحہ 854

4۔ ایضاً، الشفائی ثلاث، جلد 2، صفحہ 848، مفہوم

کے ساتھ شفا طلب نہ کی تو اس کے لئے شفا نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے نُشْرَہ کے بارے اختلاف کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی الله تعالیٰ کے اسماء میں سے یا قرآن کریم میں سے کوئی شے لکھے پھر اسے پانی کے ساتھ دھوئے پھر اسے مریض پر ملے یا اسے پلائے، تو حضرت سعید بن مسیب نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ آپ کو کہا گیا: وہ آدمی جسے اپنی بیوی سے لے لیا جاتا ہے (یعنی اس پر کوئی جادو، منتر کر دیا جاتا ہے) تو کیا وہ اس سے کھولا جائے گا اور اسے کوئی دم تعویذ کیا جائے گا؟ تو آپ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں، اور جو چیز نفع دیتی ہے اسے اس سے منع نہ کیا جائے۔ اور حضرت مجاہد کی یہ رائے نہیں کہ تو قرآن کریم کی آیات لکھے پھر انہیں دھوئے اور پھر اسے گھبراہٹ والے آدمی کو پلایا جائے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ایک برتن میں پانی پر معوذتین پڑھتی تھیں پھر آپ حکم دیتی تھیں کہ اسے مریض پر انڈیل دیا جائے۔ مازری ابو عبدالله نے کہا ہے: اہل تعزیم (دم کرنے والے) کے نزدیک نشرہ (دم، تعویذ) امر معروف ہے، اور اسے یہ نام دیا گیا ہے، کیونکہ یہ اپنے صاحب کی گرہ کھول دیتا ہے (بیماری ختم کر دیتا ہے۔) حسن اور ابراہیم نخعی نے اس سے منع کیا ہے۔ حضرت نخعی نے کہا ہے: مجھے خوف ہے کہ اسے کوئی مصیبت اور بلا آپہنچے، گویا کہ آپ اس طرف گئے ہیں کہ یہ وہ ہے جس کے ساتھ قرآن کو مٹایا گیا ہے اور اس کا اپنے پیچھے کسی آزمائش اور مصیبت تک پہنچانا اس سے زیادہ قریب ہے کہ یہ شفا کا فائدہ دے۔ اور حسن نے کہا ہے: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت جابر بن عبدالله رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے نشرہ کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ شیطان کے عمل میں سے ہے (1)''۔ علامہ ابن عبدالبر نے کہا ہے: یہ آثار لینہ ہیں اور ان کے لئے کئی وجوہ کا احتمال ہو سکتا ہے۔ تحقیق کہا گیا ہے: بے شک یہ اس معنی پر محمول ہیں کہ جب یہ اس سے باہر ہو جو کچھ کتاب الله اور رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں سے ہے، اور معروف علاج سے باہر ہو۔ اور نشرہ طب کی جنس سے ہے پس یہ ایک چیز کا دھوون ہے جو اس کے لئے بہتر ہے، پس یہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی طرح ہوا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دم کرنے میں کوئی حرج نہیں جب اس میں کوئی شرکیہ کلمہ نہ ہو اور تم میں سے جو کوئی اپنے بھائی کو نفع پہنچانے کی استطاعت رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ (دم) کرے (2)''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق ہم نے نشرہ کے بارے مرفوع نص ذکر کی ہے اور یہ کہ وہ نہیں ہوتا مگر کتاب الله سے پس چاہئے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔

مسئلہ نمبر 5۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس تحریر کو مریضوں کے گلے میں تبرک کے لئے لٹکانے میں کوئی حرج نہیں ہے جس میں الله تعالیٰ کے اسماء لکھے ہوں جبکہ اسے لٹکانے والا اس کے لٹکانے کے ساتھ نظر کا دفاع کرنے سے نڈھال

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب النشرۃ، جلد 2 صفحہ 184۔ ایضاً، باب فی النشرۃ، حدیث نمبر 3370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الطب، استحباب الرقی بالعوذ، جلد 2، صفحہ 224-223

اور عاجز نہ ہو۔ اور یہی اس کا معنی ہے قبل أن ینزل به شئ من العین (یعنی نظر سے کوئی تکلیف اور مصیبت آنے سے پہلے)۔ اور اسی قول پر اہل علم کی ایک جماعت بھی ہے، ان کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ صحت مند جانوروں یا انسانوں کے گلوں میں نظر لگنے کے خوف سے کوئی چیز لٹکائی جائے، اور ہر وہ چیز جو مصیبت آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی کتاب میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے شفا اور کشادگی کی امید رکھتے ہوئے لٹکائی جاتی ہے، تو وہ اس مباح دم کی مثل ہے نظر وغیرہ کی صورت میں جس کا مباح ہونا سنت سے ثابت ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو حالت نیند میں خوف آئے تو اسے چاہئے کہ وہ یہ کہے: أعوذ بکلمات اللہ التامة من غضبه و سوٓء عقابه و من شرّ الشیاطین و أن یَحْضُرُونِ (1)۔ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے ان بچوں کو یہ سکھاتے تھے جو ادراک رکھتے تھے، اور جو ادراک نہ رکھتے تھے آپ ان کلمات کو لکھتے اور ان کے گلے میں لٹکا دیتے۔ اور اگر کہا جائے: تحقیق روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی شے لٹکائی تو اسے اسی کے سپرد کر دیا جائے گا (2)''۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنی ام ولد کے (گلے) میں ایک بندھا ہوا تعویذ دیکھا تو آپ نے اسے انتہائی شدت اور سختی کے ساتھ کھینچا اور اسے توڑ دیا اور فرمایا: بے شک آل ابن مسعود اس شرک سے مستغنی ہے، پھر فرمایا: بے شک تعویذ، دم اور التِوَلہ یہ سب شرک ہیں۔ پوچھا گیا: یہ التِوَلہ کیا ہے؟ فرمایا: وہ جس کے ساتھ عورت اپنے خاوند کی محبوب ہو جائے (3)۔ اور عقبہ بن عامر جہنی سے مروی ہے انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''جس نے تعویذ لٹکایا تو اللہ تعالیٰ اس کو مکمل نہ کرے گا اور جس نے وَدَعہ (منکا) لٹکایا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو اطمینان عطا نہیں کرے گا (4)''۔

خلیل بن احمد نے کہا ہے: کلام عرب میں تمیمہ سے مراد قلادہ ہے، اور اہل علم کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ نظر یا مصائب کی انواع میں سے کسی کے خوف سے قلائد میں سے جو گلوں میں لٹکایا جائے تو گویا حدیث میں معنی یہ ہوا کہ جو کوئی اس تکلیف کے ڈر سے گلے میں لٹکاتا ہے جس کے نازل ہونے کی امید ہو یا یہ کہ وہ مصیبت نہ آئے اس کے آنے سے پہلے لٹکاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی صحت و عافیت کو مکمل نہ کرے۔ اور جس نے کوئی منکا وغیرہ لٹکایا اور یہ معنی میں اس کی مثل ہے۔۔۔ پس اللہ تعالیٰ اسے اطمینان نہ دے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے برکت عطا نہ کریگا جس میں اس کے لئے عافیت ہو۔ واللہ اعلم۔ اور یہ سب اس سے ڈرانا ہے جو اہل جاہلیت تعویذات اور قلائد لٹکانے کا عمل کرتے تھے، اور یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ انہیں بچاتے ہیں اور ان سے آزمائش اور مصائب کو پھیر دیتے ہیں، حالانکہ انہیں اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں پھیر سکتا، وہی عافیت عطا فرمانے والا ہے اور وہی مبتلا کرنے والا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس عمل سے منع فرمایا جو دور

1۔ جامع ترمذی، ابواب الدعوات، جلد 2، صفحہ 191۔ ایضاً، باب ماجاء فی جامع الدعوات الخ، حدیث 3451، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً، سنن ابی داود، باب کیف الرقی، حدیث نمبر 3395۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ماجاء فی کراھیة التعلیق، حدیث 1998، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المستدرک للحاکم، کتاب الطب، جلد 4، صفحہ 241، حدیث 7503 3۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 241، حدیث 7505
4۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 240، حدیث 7501۔ ایضاً، سنن ابی داود، باب فی تعلیق التمائم، حدیث نمبر 3385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جاہلیت میں وہ کرتے تھے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جو ارشاد فرمایا ہے کہ جو آزمائش اور مصیبت آنے کے بعد لٹکایا گیا وہ تمائم (تعویذات) میں سے نہیں ہے، حالانکہ بعض اہل علم نے ہر حال میں آزمائش آنے سے پہلے اور اس کے بعد تعویز لٹکانے کو مکروہ قرار دیا ہے، ناپسند کیا ہے۔ پہلا قول اثر و نظر میں زیادہ صحیح ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اس میں یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ آپ نے قرآن کے سوا ان چیزوں کو لٹکانا ناپسند کیا جو قیافہ شناسوں اور کاہنوں سے لی گئی ہوں، کیونکہ قرآن سے شفا طلب کرنا چاہئے اسے لٹکایا گیا یا نہ لٹکایا گیا ہو وہ شرک نہیں ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''جس نے کوئی شے لٹکائی تو اسے اسی کے سپرد کر دیا جائے گا(1)''۔ تو جس نے قرآن گلے میں لٹکا لیا تو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کا والی بن جائے اور وہ اسے کسی غیر کے حوالے نہیں کرے گا، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رغبت رکھی گئی ہے اور قرآن سے شفا طلب کرنے میں اسی پر توکل کیا گیا ہے۔

حضرت ابن مسیب رضی اللہ عنہ سے تعویذ کے متعلق پوچھا گیا: کیا یہ لٹکایا جا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب وہ بانس کی لکڑی یا کپڑے کے ٹکڑے میں محفوظ ہو تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔ اور یہ اس بنا پر ہے کہ لکھا ہوا قرآن ہو۔ اور حضرت ضحاک سے مروی ہے کہ وہ کوئی حرج نہیں جانتے کہ آدمی کتاب اللہ میں سے کوئی شے گلے میں لٹکائے بشرطیکہ وہ جماع اور بول و براز کے وقت اسے اتار دے۔ ابو جعفر محمد بن علی نے بچوں کو تعویذ پہنانے کے بارے رخصت دی ہے۔ اور ابن سیرین قرآن میں سے کسی شے کے بارے کوئی حرج نہ دیکھتے کہ انسان اسے لٹکائے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی غموں اور تکلیفوں کو دور کرنے والی ہے، عیوب کو پاک کرنے والی ہے اور گناہوں کو مٹانے والی ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کی تلاوت سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ثواب کی فضیلت بھی حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھا تو اس کے لئے اس کے عوض ایک نیکی ہے اور وہ ایک نیکی دس نیکیوں کی مثل ہے میں نہیں کہتا کہ الٓمّٓ حرف ہے بلکہ الف علیحدہ حرف ہے، لام علیحدہ حرف ہے اور میم علیحدہ حرف ہے۔'' ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن، صحیح اور غریب ہے(2)۔ اور یہ پہلے گزر چکی ہے۔ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا اور یہ ظالموں کے لئے ان کی تکذیب اور جھٹلانے کی وجہ سے فقط خسارہ کو ہی بڑھاتا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: جس نے بھی قرآن کے ساتھ مجالست اختیار کی تو وہ اس سے زیادتی یا کمی (نقصان) کے ساتھ ہی اٹھا، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ الآیہ اور اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى (فصلت: 44) (آپ فرمائیے: یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لئے تو ہدایت اور شفا ہے۔ اور جو ایمان نہیں لائے ان کے کانوں میں بہرہ پن ہے اور وہ ان پر (ہر حال میں) مشتبہ رہتا ہے)۔ اور یہ بھی

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب الطب، جلد 4، صفحہ 241، حدیث 7503

2۔ جامع ترمذی، کتاب فضائل القرآن، ما جاء فی من قرأ حرفا من القرآن، جلد 2، صفحہ 115۔ ایضاً، حدیث 2835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کہا گیا ہے کہ یہ فرائض واحکام میں باعث شفا ہے، کیونکہ اس میں ان کی وضاحت اور بیان ہے۔

وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾

''اور جب ہم کوئی انعام فرماتے ہیں انسان پر تو (بجائے شکر کے) وہ منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرنے لگتا ہے اور جب پہنچتی ہے اسے کوئی تکلیف تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن میں قرآن کریم خسارہ اور نقصان بڑھا دیتا ہے ان کا طریقہ اور عمل یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور وفکر اور تدبر کرنے سے اعراض کرتے ہیں اور اس کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور نَاٰ بِجَانِبِهٖ کا معنی ہے وہ تکبر کرتا ہے اور دور ہوتا ہے۔ اور ناء اسی سے مقلوب ہے اور اس کا معنی ہے: وہ اللہ عزوجل کے حقوق قائم کرنے سے دور رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے: نأى الشئ یعنی شے دور ہو گئی۔ اور نأیته اور نایت عنه دونوں کا معنی بَعُدتُ (میں اس سے دور ہوا) ہے۔ اور أنأیته فانتأ یعنی میں نے اسے دور کیا اور وہ دور ہو گیا۔ اور تناءَوْا بمعنی تباعدوا (وہ ایک دوسرے سے دور ہو گئے) اور المنتأى بہت دور جگہ۔

النابغہ نے کہا ہے:

فانّك كالليل الذى هو مُدرِكى   وان خِلتُ أن المنتأى عنك واسعُ

ابن عامر نے ابن ذکوان کی روایت میں ناء باع کی مثل پڑھا ہے، یعنی ہمزہ کو موخر کیا ہے، اور یہ نأى میں قلب کے طریقہ پر ہے، جیسے کہا جاتا ہے: راء و رأى۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ النوء سے ماخوذ ہے اس کا معنی اٹھنا اور قیام کرنا ہے۔ اور کبھی واقع ہونے اور بیٹھنے کے لئے بھی نوء کہا جاتا ہے، اور یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ اور وَ نِہِی نون کے فتحہ اور ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ بھی یہ پڑھا گیا ہے۔ اور عام قرأت نأى، رأى کے وزن پر ہے۔ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا یعنی جب اسے فقر و افلاس، بیماری یا محتاجی کی شدت کی وجہ سے کوئی تکلیف اور پریشانی لاحق ہو تو وہ مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے؛ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر یقین اور اعتماد نہیں رکھتا۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾

''آپ فرما دیجئے کہ ہر شخص عمل پیرا ہے اپنی فطرت کے مطابق، پس تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر (گامزن) ہے۔''

قول تعالیٰ: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: ہر شخص اپنی جہت پر عمل پیرا ہے، اور یہ ضحاک نے بھی کہا ہے۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ہر شخص اپنی طبیعت پر عمل پیرا ہے۔ اور آپ ہی سے یہ بھی ہے کہ ہر شخص علیحدہ طور پر عمل پیرا ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: ہر شخص اپنے دین پر عمل پیرا ہے۔ حسن اور قتادہ نے کہا ہے(1): ہر شخص اپنی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 481، مفہوم

نیت پر عمل پیرا ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: ہر شخص اپنی فطرت پر عمل پیرا ہے۔ فراء نے کہا ہے: ہر شخص اپنے اس طریقہ اور مذہب پر عمل پیرا ہے جس پر اس کی فطرت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ فرما دیجئے ہر شخص اس پر عمل پیرا ہے جو اس کے نزدیک اس کے اعتقاد کے زیادہ مشابہ اور صواب و صحیح کے زیادہ قریب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ الشکل سے ماخوذ ہے؛ کہا جاتا ہے: لستَ علی شَکْلِی ولا شاکلتی (تو میری شکل اور مزاج پر نہیں ہے)۔

شاعر نے کہا ہے:

كل امرئ يشبهه فعله   ما يفعل المرء فهو أهله

پس شکل سے مراد مثل، نظیر، اور ضرب (قسم) ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ۝ (ص) (اور اس کے علاوہ اس کی مانند طرح طرح کا عذاب)۔ اور الشِّکل (شین کے کسرہ کے ساتھ) اس کا معنی ہیئت ہے۔ کہا جاتا ہے: جارية حسنة الشِكل (ایسی لونڈی جو ہیئت اور شکل کے اعتبار سے خوبصورت ہو۔) یہ تمام اقوال باہم متقارب ہیں۔ اور اس کا معنی ہے کہ ہر کوئی اس کے مطابق عمل کرتا ہے جس پر اس کی وہ اصل اور اخلاق مترتب ہوتے ہیں جن سے وہ مرکب ہے، اور یہ کافر کی مذمت اور مومن کی مدح ہے۔ یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت دونوں ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں؛ اسے مہدوی نے ذکر کیا ہے۔ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا یعنی مومن اور کافر اور جو کچھ ان میں سے ہر ایک سے حاصل ہوتا ہے (اس کے بارے تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر گامزن ہے)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اَهْدٰى سَبِيْلًا یعنی کون زیادہ تیزی سے قبول ہونے والا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کون دین کے اعتبار سے زیادہ حسین ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم کے بارے میں باہم مذاکرہ اور گفتگو کی، پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا اور میں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے زیادہ امید افزا اور احسن قول کوئی نہیں دیکھا: قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ کیونکہ بندے کی فطرت نہیں ہوتی مگر عصیان اور گناہ اور رب کریم کی فطرت نہیں مگر غفران اور بخشش۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا پس میں نے اس میں اس ارشاد باری تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی امید افزا اور احسن قول نہیں دیکھا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ (غافر) (حا۔ میم اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو زبردست ہے سب کچھ جاننے والا ہے، گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول فرمانے والا، سخت سزا دینے والا، فضل و کرم فرمانے والا ہے)۔

اس میں گناہوں کی مغفرت کو توبہ کی قبولیت پر مقدم کیا گیا ہے، اور اس میں اشارہ مومنوں کے لئے ہے۔ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک سارا قرآن کریم پڑھا اور میں نے اس آیت سے زیادہ حسین اور امید افزا کوئی آیت نہیں دیکھی: نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (الحجر) (بتا دو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں) اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے سارا قرآن اوّل سے لے

کر آخر تک پڑھا اور میں نے اس آیت سے زیادہ کوئی حسین اور امید افزا آیت نہیں دیکھی: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (الزمر) (آپ فرمایئے: اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر، مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے، یقیناً اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو، بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: میں نے اوّل سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا اور میں نے اس قول باری تعالیٰ سے زیادہ حسین اور امید افزا کوئی آیت نہیں دیکھی: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (الانعام) (وہ جو ایمان لائے اور نہ ملایا انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے انہیں کے لیے ہی امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔)

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا

”یہ دریافت کرتے ہیں آپ سے روح کی حقیقت کے متعلق، (انہیں) بتایئے: روح میرے رب کے حکم سے ہے اور نہیں دیا گیا ہے تمہیں علم مگر تھوڑا سا۔“

امام بخاری، امام مسلم اور ترمذی نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے کہا: اس اثنا میں کہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں ایک کھیت میں تھا درآنحالیکہ آپ کھجور کے ایک تنے کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے کہ وہاں سے یہودی گزرے تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: تم ان سے روح کے بارے سوال کرو، تو آپ نے فرمایا: کون سی چیز تمہیں اس پر اکسا رہی ہے؟ اور ان میں سے بعض نے کہا: وہ تمہیں کسی ایسی چیز کی طرف متوجہ نہیں کریں گے جسے تم ناپسند کرتے ہو، تو انہوں نے کہا: پس تم ان سے سوال کرو۔ چنانچہ انہوں نے آپ سے روح کے بارے سوال کر دیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکے رہے اور ان پر کوئی جواب نہ لوٹایا، تو میں جان گیا کہ آپ کی طرف وحی کی جائے گی، پس میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، تو جب وحی نازل ہوئی فرمایا: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا یہ الفاظ بخاری کے ہیں (1)۔ اور مسلم میں ہے: پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکوت اختیار فرمایا۔ اور اس میں: وما اُوتوا ہے۔ تحقیق لوگوں نے اس روح کے بارے اختلاف کیا ہے جس کے بارے سوال کیا گیا کہ وہ کون سی روح ہے؟ تو کہا گیا ہے: وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں؛ یہ حضرت قتادہ نے کہا ہے۔ فرمایا: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اسے چھپاتے تھے (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ قرآن ہے، اس کا بیان سورۂ شوریٰ کے آخر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے اس کے ستر ہزار منہ ہیں، ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں ہر زبان میں ستر ہزار لغات ہیں، وہ ان تمام لغات کے ساتھ اللہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ اسراء، جلد 2، صفحہ 686۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ومن سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3066، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 180

تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر تسبیح سے ایک فرشتہ تخلیق فرماتا ہے جو یوم قیامت تک ملائکہ کے ساتھ اڑتا رہے گا(1)، اسے علامہ طبری نے ذکر کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے(2): میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: علامہ بیہقی نے بیان کیا ہے کہ ہمیں ابوزکریا نے ابواسحاق سے خبر دی ہے کہ ہمیں ابوالحسن طرائفی نے خبر دی ہے کہ ہمیں عثمان بن سعید نے بتایا ہے انہوں نے کہا ہمیں عبداللہ بن صالح نے معاویہ بن صالح سے انہوں نے علی بن ابی طلحہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ کے بارے میں بتایا کہ آپ فرماتے ہیں: روح سے مراد فرشتہ ہے(3)۔ اور یہ اپنی اسناد کے ساتھ معاویہ بن صالح سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا مجھے ابوہران (ھا کے کسرہ کے ساتھ) یزید بن سمرہ نے اس سے بیان کیا جس نے اسے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بیان کیا کہ آپ نے قول باری تعالیٰ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ کے بارے فرمایا: یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے اس کے ستر ہزار منہ ہیں ... الحدیث۔ مذکورہ الفاظ اور معنی میں ہے۔

اور حضرت عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: روح ایک فرشتہ ہے جس کے گیارہ ہزار پر اور ایک ہزار منہ ہیں، وہ یوم قیامت تک اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا رہے گا؛ اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور آپ ہی سے روایت ہے: یہ اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے ان کے ہاتھ اور پاؤں ہیں اور وہ کھانا بھی کھاتے ہیں؛ اسے غزنوی نے ذکر کیا ہے۔ اور خطابی نے کہا ہے، اور بعض نے کہا ہے: یہ (روح) فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے اور خلقت کے اعتبار سے ان کی نسبت عظیم صفت سے متصف ہے۔ اور اکثر اہل تاویل کا موقف یہ ہے کہ انہوں نے اس روح کے بارے سوال کیا جس کے سبب جسم میں زندگی ہوتی ہے۔ اور ان میں سے اہل نظر وفکر نے کہا ہے: بے شک انہوں نے آپ سے روح کی کیفیت اور بدن انسانی میں اس کے چلنے کے بارے پوچھا، اور اس کے بارے کہ وہ کیسے بدن کے ساتھ مل جاتی ہے اور اس کے ساتھ زندگی کے اتصال کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ ایسی شے ہے جسے اللہ عزوجل کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور ابوصالح نے کہا ہے کہ روح ایک مخلوق ہے جیسا کہ بنی آدم ہے اور وہ بنی آدم میں سے نہیں ہیں، اور ان کے ہاتھ اور پاؤں بھی ہیں، اور صحیح یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ کا ابہام روح کے مخلوق ہونے پر دلیل ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے امر سے ایک اُمر عظیم اور شان کبیر ہے، درآنحالیکہ اللہ تعالیٰ نے اسے مبہم رکھا ہے اور اس کی تفصیل چھوڑ دی ہے، تاکہ انسان بالیقین جان لے کہ وہ اپنے نفس کی حقیقت جاننے سے عاجز ہے اس کے باوجود کہ اسے اس کے وجود کا علم ہے۔ اور جب انسان اپنی ذات کی معرفت میں اس طرح ہے تو وہ حق کی حقیقت کا ادراک کرنے سے بدرجہ اولیٰ عاجز ہے۔ اور اس کی حکمت یہ ہے کہ مخلوق کی معرفت کے ادراک سے عقل کو عاجز قرار دینا اس کا مجاور ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ وہ اپنے خالق کے ادراک سے زیادہ عاجز ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا اس کے بارے اختلاف ہے جسے اس کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے۔ پس

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 180 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 482 3۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 180

ایک فرقہ نے کہا ہے: مراد فقط سوال کرنے والے ہیں۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: ان سے مراد سارے کے سارے یہودی ہیں(1)۔ اور اسی بنا پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت وَ مَاۤ اُوْتُوْا ہے(2) اور آپ نے اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے: اس سے مراد سارا عالم ہے(3)۔ اور یہی صحیح ہے۔ اور اسی کے مطابق جمہور کی قرأت وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ ہے۔ تحقیق یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: کیسے ہمیں صرف تھوڑا سا علم دیا گیا ہے حالانکہ ہمیں تورات عطا کی گئی ہے اور وہ سراپا حکمت ہے، اور جسے حکمت عطا کی گئی اسے خیر کثیر عطا کر دیا گیا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا مقابلہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ کیا تو وہ مغلوب ہو گئے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض احادیث میں اپنے اس قول کے ساتھ نص بیان کی: کُلًّا یعنی وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ سے مراد جمیع عالم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہودیوں نے آپ کو کہا: ہم مراد لئے گئے ہیں یا آپ کی قوم؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کُلًّا۔ اور اس معنی میں یہ آیت نازل ہوئی ہے: وَ لَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ (لقمان: 27) (اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلمیں بن جائیں۔)

اسے علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ روح کے متعلق سوال کرنے والے قریش تھے، یہودیوں نے ان کو کہا: تم ان سے اصحاب کہف، ذوالقرنین اور روح کے بارے پوچھو، پس اگر یہ تمہیں دو کے بارے خبر دے دیں اور ایک سے رک جائیں تو پھر یہ نبی ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے بارے آگاہ کر دیا جیسا کہ آگے آرہا ہے، اور روح کے بارے فرمایا: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ یعنی روح وہ امر ہے جسے سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، اسے مہدوی وغیرہ مفسرین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔

وَ لَىٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا ﴿۸۷﴾

''اور اگر ہم چاہتے تو سلب کر لیتے وہ وحی جو ہم نے آپ کی طرف کی ہے پھر آپ کوئی ایسا وکیل نہ پاتے جو آپ کے لئے اس کے متعلق ہماری بارگاہ میں وکالت کرتا۔ سوائے اپنے رب کی رحمت کے (کہ وہ ہمہ وقت آپ کے شامل حال ہے) یقیناً اس کا فضل (وکرم) آپ پر بہت بڑا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَىٕنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ مراد قرآن کریم ہے، یعنی جس طرح ہم اسے نازل کرنے پر قادر ہیں اسی طرح ہم اسے سلب کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں یہاں تک کہ مخلوق اسے بھول جائے اور یہ آیت اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے: وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۵﴾ یعنی اگر میں چاہوں کہ میں اس قلیل اور تھوڑے علم کو سلب کرلوں تو میں اس پر قادر ہوں۔ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیْنَا وَكِیْلًا پھر آپ کوئی ایسا مددگار نہ پاتے جو اسے آپ پر لوٹا سکتا۔ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لیکن ہم اسے نہیں چاہیں گے (اور یہ) آپ کے رب کی رحمت ہے؛ پس یہ استثناء پہلے سے نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مگر یہ کہ آپ کا رب آپ پر رحم فرمائے اور وہ اسے سلب نہ کرے۔ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا (یقیناً اس

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 482 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کا فضل وکرم آپ پر بہت بڑا ہے) جبکہ اس نے آپ کو اولاد آدم کا سردار بنایا ہے، اور آپ کو مقام محمود اور یہ کتاب عزیز عطا فرمائی ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اپنے دین میں سے جو چیز تم سب سے پہلے گم کرو گے وہ امانت ہے، اور آخر میں جو چیز تم سے مفقود ہوگی وہ نماز ہے، اور یہ قرآن گویا تم سے چھین لیا جائے گا، تم ایک دن صبح کرو گے اور تمہارے پاس اس سے کوئی شے نہ ہوگی۔ تو ایک آدمی نے کہا: اے ابا عبدالرحمن! یہ کیسے ہوگا؟ حالانکہ ہم نے اسے اپنے دلوں میں راسخ کر رکھا ہے اور ہم نے اسے اپنے مصاحف میں لکھ رکھا ہے، ہم اپنے بیٹوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں اور ہمارے بیٹے اپنے بیٹوں کو اس کی تعلیم دیں گے اور یہ یوم قیامت تک سلسلہ جاری رہے گا۔ تو آپ نے فرمایا: ایک رات میں وہ کوئی ایسی چیز بھیجے گا جس کے ساتھ وہ مصاحف اور دلوں میں جو کچھ ہے وہ سب لے جائے گا، اور لوگ چوپاؤں کی مثل صبح کریں گے۔ پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ الآیہ۔ اس کو ابو بکر بن ابی شیبہ نے اس معنی کے ساتھ بیان کیا ہے، انہوں نے کہا: ہمیں ابو الاحوص نے عبدالعزیز بن رفیع سے انہوں نے شداد بن معقل سے بیان کیا کہ انہوں نے بیان کیا، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: بے شک یہ قرآن کریم جو تمہارے درمیان ہے عنقریب تم سے چھین لیا جائے گا، سلب کر لیا جائے گا۔ انہوں (شداد بن معقل) نے بیان کیا: میں نے کہا: یہ ہم سے کیسے چھین لیا جائے گا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے دلوں میں راسخ کر رکھا ہے اور ہم نے اسے اپنے مصاحف میں ثابت اور محفوظ کر رکھا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: وہ ایک ہی رات میں اس پر کوئی ایسی چیز چلائے گا اور جو کچھ دلوں میں ہے وہ اسے چھین لے گا، سلب کر لے گا، اور جو کچھ مصاحف میں ہے اسے مٹا دے گا اور لوگ اس حال میں صبح کریں گے کہ وہ اس سے خالی اور محروم ہو چکے ہوں گے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اور یہ اسناد صحیح ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ قرآن کریم ادھر لوٹ جائے گا جہاں سے نازل ہوا، اور اس کی بھنبھناہٹ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ہوگی، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تجھے کیا ہوا ہے؟ تو وہ کہے گا: اے میرے رب! میں تجھ سے نکلا تھا اور تیری ہی طرف لوٹ آیا ہوں، میں تلاوت کیا جاتا رہا لیکن میرے مطابق عمل نہ کیا گیا، مجھے پڑھا جاتا رہا اور میرے ساتھ عمل نہ کیا گیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تحقیق اس معنی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث مروی ہے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اسلام مٹ جائے گا جیسے کپڑے کے نقش ونگار مٹ جاتے ہیں یہاں تک کہ یہ معلوم نہیں ہوگا کہ روزہ کیا ہے اور نہ ہی نماز، قربانی اور صدقہ وغیرہ کے بارے کوئی علم ہوگا پس ایک ہی رات میں کتاب اللہ پر کوئی چیز چلائی جائے گی تو زمین میں کوئی آیت باقی نہ رہے گی اور لوگوں کے کچھ گروہ باقی رہ جائیں گے، بوڑھے مرد اور عورتیں کہیں گے، ہم نے اپنے آباء واجداد کو اس کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پر پایا تھا۔ اور وہ یہ نہیں جانتے تھے نماز کیا ہے اور نہ وہ روزے، قربانی اور صدقہ وغیرہ کے بارے جانتے تھے''۔

صلہ (بن زفر عبسی) نے انہیں کہا: انہیں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کوئی فائدہ نہیں دے گا! درآنحالیکہ وہ یہ نہیں جانتے ہوں گے

نماز کیا ہے اور روزہ، قربانی اور صدقہ وغیرہ کے بارے بھی نہیں جانتے ہوں گے، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان سے منہ پھیر لیا، پھر انہوں نے یہی بات تین بار دہرائی، اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ہر بار اس سے اعراض کرتے رہے۔ پھر آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اے صلہ! یہ انہیں آتش جہنم سے نجات دلا دے گا اور آپ نے یہی جملہ (تنجیهم من النار)(1) تین بار فرمایا۔ اسے ابن ماجہ نے سنن میں نقل کیا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر تشریف لائے اس حال میں کہ آپ اپنے سر مبارک کو درد کی وجہ سے لپیٹے ہوئے تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور منبر پر تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا: ''اے لوگو! کیا یہ تحریریں اور کتابیں جو تم لکھ رہے ہو کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کے سوا کوئی کتاب ہے؟ قریب ہے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کی وجہ سے ناراض ہو جائے پس وہ کوئی ورق (کاغذ) نہیں چھوڑے گا اور نہ کوئی دل مگر اس سے سلب کر لے گا''۔ صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اس وقت مومن مرد اور مومن عورتوں کا حال کیا ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جس کے لئے اس کے ساتھ خیر اور بھلائی کا ارادہ فرمائے گا تو اس کے دل میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ باقی رکھے گا۔'' اسے ثعلبی اور غزنوی وغیرہما نے تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ﴿۸۸﴾

''(بطور چیلنج) کہہ دو کہ اگر اکٹھے ہو جائیں سارے انسان اور سارے جن اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن کی مثل تو ہرگز نہیں لا سکیں گے اس کی مثل اگرچہ وہ ہو جائیں ایک دوسرے کے مددگار۔''

یعنی ظہیر کا معنی معاون و مددگار ہے، جس طرح شعراء شعر کے بیت میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور وہ اسے قائم کرتے ہیں۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کفار نے کہا: اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس کی مثل کہہ دیں، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جھٹلا دیا۔ قرآن کے اعجاز کے بارے میں بحث کتاب کے شروع میں گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔ اور لَا یَاْتُوْنَ، لَىِٕنِ میں موجود قسم کا جواب ہے اور شرط کے ارادہ پر اسے جزم دی جا سکتی ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

لئن کان ما حُدِّثتِه الیوم صادقا — أقم فی نهار القیظ للشمس بادیا

وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ٘ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

''اور بلاشبہ ہم نے طرح طرح سے (بار بار) بیان کی ہیں لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں (تاکہ وہ ہدایت پائیں) پس انکار کر دیا اکثر لوگوں نے سوائے اس کے کہ وہ ناشکری کریں۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ یعنی ہم نے اس میں ہر مثال کے ساتھ قول کی توجیہ بیان

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الفتن، ذهاب القرآن والعلم، جلد 1، صفحہ 303۔ ایضاً، باب ذهاب القرآن والعلم، حدیث 4038، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی جس کے ساتھ اعتبار اور نظر وفکر واجب ہوتی ہے، مثلاً آیات، عبرتیں، ترغیب وترہیب، اوامر ونواہی، پہلے لوگوں کے قصص اور واقعات، جنت و دوزخ اور قیامت وغیرہ۔ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا اور ان سے مراد اہل مکہ ہیں، ان کے لئے حق واضح کردیا اور ان کے لئے (اسے) کھول دیا اور انہیں مہلت دی یہاں تک کہ ان کے لئے ظاہر ہوگیا کہ یہ حق ہے، لیکن انہوں نے حق واضح اور ظاہر ہونے کے وقت سوائے کفر کے (ہر شے کا) انکار کردیا۔ مہدوی نے کہا ہے: ان کے اس قول میں قدریہ کے لئے کوئی حجت نہیں ہے۔ اَبٰى (اس نے انکار کیا) کا لفظ نہیں بولا جاتا مگر اس کے لئے جو اسے کرنے سے انکار کرے جس پر وہ قادر ہو، کیونکہ کافر اگرچہ ایمان لانے پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس سے اعراض کرنے اور اپنے دل پر اس کے مہر لگائے جانے کے سبب قادر نہیں ہے، لیکن وہ وسعت اور مہلت کے وقت میں تو حق کی طلب اور باطل سے اسے ممتاز کرنے پر قادر ہے۔

وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ
مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا
زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۙ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ
اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ
سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

''اور کفار نے کہا: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ پر جب تک آپ رواں نہ کردیں ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ، یا (لگ کر تیار) ہو جائے آپ کے لئے ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا پھر آپ جاری کردیں ندیاں جو اس باغ میں (ہر طرف) بہہ رہی ہوں، یا آپ گرادیں آسمان کو جیسے آپ کا خیال ہے، ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کرکے یا آپ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو (بے نقاب کرکے) ہمارے سامنے لے آئیں، یا (تعمیر) ہو جائے آپ کے لئے ایک گھر سونے کا، یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں۔ بلکہ ہم تو اس پر بھی ایمان نہ لائیں گے کہ آپ آسمان پر چڑھیں یہاں تک کہ اتار لائیں ہم پر ایک کتاب جسے ہم پڑھیں، آپ (ان سب خرافات کے جواب میں اتنا) فرمادیں کہ میرا رب (ہر عیب سے) پاک ہے میں کون ہوں مگر آدمی (اللہ کا) بھیجا ہوا۔''

قولہ تعالیٰ: وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا یہ آیت رؤساء قریش کے بارے میں نازل ہوئی مثلاً عتبہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان اور نضر بن حارث، ابوجہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ، امیہ بن خلف اور ابوالبختری، اور ولید بن مغیرہ وغیرہم۔ اور وہ اس طرح کہ جب وہ قرآن کریم کا معارض لانے سے عاجز آگئے اور وہ اس کے معجزہ ہونے پر بھی راضی نہ ہوئے، تو ابن اسحاق وغیرہ کے بیان کے مطابق وہ کعبہ معظمہ کے پاس غروب آفتاب کے بعد اکٹھے ہوئے، پھر ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: محمد (ﷺ) کے پاس چلو اور ان سے گفتگو کرو، مباحثہ کرو یہاں تک کہ تمہیں اس بارے میں الزام سے بری کردیا جائے، پس انہوں نے آپ کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ کی قوم کے اشراف آپ کے لئے جمع ہیں تاکہ وہ

آپ کے ساتھ گفتگو کریں لہٰذا آپ ان کے پاس تشریف لائیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے درآنحالیکہ آپ گمان کر رہے تھے کہ جس بارے میں آپ نے ان کے ساتھ گفتگو کی ہے اس بارے میں ان کے لئے کوئی چیز ظاہر ہو گئی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حریص تھے آپ ان کی رشد و ہدایت کو پسند کرتے تھے اور ان کی سرکشی اور رعونت آپ پر گراں گزرتی تھی، یہاں تک کہ آپ ان کے پاس بیٹھ گئے تو انہوں نے آپ کو کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف پیغام بھیجا ہے تاکہ ہم آپ سے گفتگو کریں، اور بلاشبہ قسم بخدا! ہم پورے عرب میں کسی آدمی کو نہیں جانتے جس نے اپنی قوم میں اس طرح مداخلت کی ہو جیسے آپ نے اپنی قوم میں مداخلت کی ہے، تحقیق آپ نے آباء و اجداد کو گالیاں دی ہیں، دین میں عیب اور نقص بیان کیا ہے، الٰہوں کو برا کہا ہے، جوانوں کو بے وقوف اور احمق قرار دیا ہے اور اجتماعیت کو تقسیم کر دیا ہے، نتیجۃً کوئی قبیح امر باقی نہیں مگر وہ ہمارے اور آپ کے درمیان ظاہر ہوا، یا اسی طرح کی کئی باتیں انہوں نے آپ سے کہیں، پس اگر آپ نے یہ بات اس لئے کی ہے کہ آپ اس کے بدلے مال چاہتے ہیں تو ہم آپ کے لئے اپنے اموال اکٹھے کرتے ہیں یہاں تک کہ آپ ہم سے زیادہ مالدار ہو جائیں گے، اور اگر آپ اس سے شرف و سرداری کے طالب ہیں تو ہم آپ کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں، اور اگر آپ اس سے بادشاہی اور حکومت چاہتے ہیں تو ہم آپ کو اپنے اوپر حاکم تسلیم کرتے ہیں، اور اگر یہ آپ سے کسی جن کی اتباع کی وجہ سے ہو رہا ہے جسے آپ دیکھتے ہیں کہ وہ آپ پر غالب ہے تو ہم کثرت سے اپنے اموال آپ کے علاج کے لئے خرچ کرتے ہیں تاکہ ہم آپ کو اس سے برأت دلا سکیں یا آپ کو معذور قرار دے سکیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''مجھے اس میں سے کچھ بھی نہیں جو تم کہہ رہے ہو جو کچھ میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں وہ اس لئے نہیں لایا کہ تم سے اموال کا مطالبہ کروں اور اس لئے کہ تم میں سردار بن جاؤں اور نہ اس لئے کہ تم پر حاکم بن جاؤں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس نے مجھ پر کتاب نازل فرمائی ہے اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہارے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہو جاؤں، چنانچہ میں نے اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا دیئے ہیں اور میں نے تمہیں نصیحت کر دی ہے پس اگر تم مجھ سے وہ قبول کر لو جو میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں تو وہی دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے باعث سعادت ہے اور اگر تم اسے مجھ پر لوٹا دو (رد کر دو) تو میں اللہ تعالیٰ کے امر کی وجہ سے صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔'' او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ انہوں نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) جو چیزیں ہم نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں اگر آپ ان میں سے کوئی شے بھی قبول نہیں کرتے تو پھر آپ جان لیجئے کہ لوگوں میں سے کوئی نہیں جس کا شہر ہم سے زیادہ تنگ ہو، نہ کوئی ایسا ہے جس کے پاس ہم سے زیادہ پانی کی کمی اور قلت ہو اور نہ کوئی ایسا ہے جو ہم سے زیادہ زندگی کو سخت، تلخ اور تکلیف دہ گزارنے والا ہو، پس آپ اپنے اس رب سے التجا کیجئے جس نے آپ کو اس کے ساتھ بھیجا جس کے ساتھ آپ کو مبعوث فرمایا کہ وہ ہم سے ان پہاڑوں کو دور ہٹا لے جنہوں نے ہم پر ماحول تنگ کر رکھا ہے، اور چاہئے کہ وہ ہمارے شہر کو کھول دے، وسیع کر دے اور ان میں ہمارے لئے شام کی نہروں کی طرح نہریں جاری کر دے، اور ہمارے وہ آباء جو گزر چکے ہیں انہیں ہمارے لئے زندہ کر دے، اور چاہئے کہ وہ ہمارے لئے قصی

بن کلاب کو زندہ کر دے، کیونکہ وہ سچے شیخ تھے اور ہم ان سے اس کے بارے پوچھیں گے جو آپ کہتے ہیں: کیا وہ حق ہے یا باطل ہے؟ اور اگر انہوں نے آپ کی تصدیق کر دی اور آپ نے وہ کیا جو ہم نے آپ سے کہا ہے تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے اور ہم اس کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کا مقام و مرتبہ پہچان لیں گے، اور یہ کہ اس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے جیسے آپ کہتے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''میں اس کے ساتھ تمہاری طرف نہیں بھیجا گیا بلاشبہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے تمہاری طرف وہ لایا ہوں جس کے ساتھ اس نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اور میں نے تم تک وہ پیغام پہنچا دیا ہے جس کے ساتھ میں تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں پس اگر تم اسے قبول کر لو تو یہ دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے سعادت ہے اور اگر تم اسے مجھ پر لوٹا دو (یعنی رد کر دو) تو میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔'' انہوں نے کہا: اور اگر تم یہ ہمارے لئے نہیں کرتے تو اپنے آپ کو ہی لے لیجئے! اپنے رب سے التجا کیجئے کہ وہ آپ کے ساتھ ایک فرشتہ بھیجے جو آپ کی اس بارے میں تصدیق کرتا ہو جو آپ کہتے ہیں اور ہمیں آپ سے واپس لوٹا دے، اور یہ سوال کیجئے کہ وہ آپ کے لئے باغات، محلات اور سونے، چاندی کے خزانے بنا دے اور وہ ان کے سبب آپ کو اس سے غنی کر دے جو ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ چاہتے ہیں؟ کیونکہ آپ بازاروں میں جاتے ہیں اور اسی طرح معاش، کاروبار تلاش کرتے ہیں جیسے ہم اسے تلاش کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہم آپ کے رب کی طرف سے آپ کی فضیلت اور آپ کا مرتبہ جان لیں اگر آپ رسول ہیں جیسا کہ آپ گمان کرتے ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''میں یہ کرنے والا نہیں اور نہ میں وہ ہوں جو اپنے رب سے یہ سوال کرے اور نہ میں تمہاری طرف اس کے ساتھ بھیجا گیا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے أو کما قال... پس اگر تم مجھ سے وہ قبول کر لو جو میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں تو یہ دنیا اور آخرت میں تمہاری سعادت ہے اور اگر تم اسے مجھ پر واپس لوٹا دو تو میں اللہ تعالیٰ کے امر کے لیے صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے''۔ انہوں نے کہا: پس وہ ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے جیسا کہ آپ کا گمان ہے کہ آپ کا رب اگر چاہے تو وہ یہ کر سکتا ہے، کیونکہ ہم ہرگز آپ کے ساتھ ایمان نہیں لائیں گے مگر تب کہ آپ ایسا کریں۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے اگر وہ تمہارے ساتھ ایسا کرنا چاہے تو کر لے۔'' انہوں نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ کا رب جانتا نہیں کہ ہم آپ کے پاس بیٹھیں گے اور ہم آپ سے اس بارے سوال کریں گے جو ہم نے آپ سے سوالات کئے ہیں اور ہم آپ سے وہ مطالبہ کریں گے جو اب ہم مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ پہلے ہی آپ کی طرف توجہ فرماتا اور آپ کو اس کے بارے آگاہ کر دیتا ہے جس کے ساتھ آپ ہمیں لوٹا سکتے ہیں اور وہ آپ کو اس کے بارے خبر دے دیتا جو کچھ وہ اس بارے ہمارے ساتھ کرنے والا ہے جب ہم آپ سے وہ قبول نہ کریں جو آپ ہمارے پاس لائے ہیں؟ بے شک ہمیں تو یہ خبر پہنچی ہے کہ یمامہ کا ایک آدمی آپ کو یہ سکھلاتا ہے اس کو رحمٰن کہا جاتا ہے، اور ہم قسم بخدا! رحمٰن کے ساتھ کبھی ایمان نہیں لائیں گے، تحقیق ہم آپ کے بارے میں معذور ہیں۔ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قسم بخدا! ہم آپ کو اور جو کچھ ہماری طرف سے آپ کو پہنچا ہے اسے نہیں چھوڑیں گے یہاں تک کہ ہم آپ کو ہلاک کر دیں

گے یا آپ ہمیں ہلاک کر دیں گے۔ اور ان میں سے کسی کہنے والے نے کہا: ہم فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اور بعض نے کہا: ہم آپ کے ساتھ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے بارے میں کوئی ضامن لے آئیں۔ پس جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہا، تو آپ ان سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم بھی کھڑا ہو گیا، اور یہ آپ کی پھوپھی کا بیٹا تھا، اور وہ عاتکہ بنت عبدالمطلب تھیں، تو اس نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کی قوم نے آپ پر وہ کچھ پیش کیا جو انہوں نے پیش کیا اور آپ نے اسے ان سے قبول نہ فرمایا، پھر انہوں نے آپ سے اپنے بارے میں چند امور کے بارے سوال کیا تا کہ وہ اس کے سبب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کا مقام و مرتبہ پہچان لیں جیسا کہ تم کہتے ہو اور وہ تمہاری تصدیق کریں اور تمہاری اتباع کریں لیکن تم نے وہ نہیں کیا، پھر انہوں نے تم سے یہ سوال کیا کہ اپنے آپ کے لئے ایسی چیزیں لے لیں جن کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر آپ کی فضیلت اور مرتبہ ظاہر ہو جائے لیکن آپ نے وہ بھی نہیں کیا۔ پھر انہوں نے آپ سے سوال کیا کہ آپ انہیں جس عذاب وغیرہ سے ڈرا رہے ہیں اس میں سے کوئی چیز ان پر فوراً اور جلدی لے آئیں، آپ نے یہ بھی نہیں کیا...... یا جس طرح کی باتیں اس نے آپ سے کیں...... پس قسم بخدا! میں آپ کے ساتھ کبھی ایمان نہیں لاؤں گا یہاں تک کہ آپ آسمان کی طرف ایک سیڑھی بنائیں، پھر اس میں چڑھیں اور میں دیکھتا رہوں یہاں تک کہ آپ اس (آسمان) تک پہنچ جائیں پھر آپ وہاں سے اپنے ساتھ تحریری عہد نامہ لائیں اس کے ساتھ چار فرشتے ہوں جو آپ کی شہادت دیں کہ آپ اسی طرح ہیں جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔ اور قسم بخدا! اگر آپ ایسا کر لیں تو میں گمان نہیں کرتا کہ میں آپ کی تصدیق کروں گا۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منہ پھیر کر چلا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی غمزدہ ہو کر اپنے اہل خانہ کی طرف لوٹ آئے آپ کو اس پر شدید افسوس تھا کہ آپ اسے نہ پا سکے جو آپ اپنی قوم سے اس وقت طمع اور امید رکھتے تھے جس وقت انہوں نے آپ کو بلایا، اور اس وجہ سے کہ آپ نے انہیں اس سے بہت دور ہوتے ہوئے دیکھا؛ یہ تمام الفاظ ابن اسحاق کے ہیں۔

اور واحدی نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے: پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا، ینبوعا کا معنی چشمہ ہے (1)؛ یہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور یہ یفعول کے وزن پر ہے، اور نبع ینبع سے ماخوذ ہے۔ اور ائمہ نے تفجر الانهار کے مشدد ہونے میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔ ابو عبید نے کہا ہے: پہلا بھی اسی کی مثل ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے: پہلا اس کی مثل نہیں ہے، کیونکہ پہلے کے بعد ینبوع ہے اور وہ واحد ہے، اور دوسرے کے بعد الأنهار ہے اور یہ جمع ہے؛ اسی طرح حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ینبوع کا معنی پانی کا چشمہ ہے، اور اس کی جمع ینابیع ہے۔ اور حضرت قتادہ نے اویکون لك جنة پڑھا ہے۔ خِلٰلَهَا یعنی اس کے درمیان۔ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ یہ قرأت عامہ ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے او یسقط السماء پڑھا ہے یعنی فعل کی نسبت آسمان کی طرف کی ہے۔ كِسَفًا اس کا معنی قطعہ یعنی ٹکڑا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی ہے (2)۔ اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 184
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 273

الکِسَف (سین کے فتحہ کے ساتھ) کِسَفَة کی جمع ہے، اور حضرت نافع، ابن عامر، اور عاصم کی قرأت ہے۔ اور باقیوں نے کِسْفًا (سین کے سکون کے ساتھ) پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: جنہوں نے کِسْفًا من السماء پڑھا ہے، انہوں نے اسے واحد بنایا ہے، اور جنہوں نے اسے کِسَفًا پڑھا ہے انہوں نے اسے جمع بنایا ہے۔ مہدوی نے کہا ہے: جنہوں نے سین کو ساکن قرار دیا ہے اس میں یہ بھی جائز ہے کہ وہ کِسْفَة کی جمع ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ مصدر ہو، اور کسفت الشئ جب تو کسی شی کو ڈھانپ لے سے ماخوذ ہو، تو گویا انہوں نے یہ کہا: تو ایسا ٹکڑا ہم پر گرا جو ہمیں گھیرنے اور ڈھانپنے والا ہو۔

اور جوہری نے کہا ہے: الکِسْفَة اس کا معنی ہے کسی شے کا ایک ٹکڑا، کہا جاتا ہے: أعطنی کسفة من ثوبك (اپنے کپڑے سے ایک ٹکڑا مجھے دے دو) اور اس کی جمع کِسَف اور کسف ہے۔ اور کہا جاتا ہے: الکِسْف اور الکِسْفَة یہ واحد ہیں۔ اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِیْلًا یعنی آپ الله تعالیٰ اور فرشتوں کو اس طرح سامنے لے آئیں کہ انہیں دیکھا جاسکے؛ یہ حضرت قتادہ اور ابن جریج کا قول ہے۔ اور حضرت ضحاک اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قَبِیْلًا کا معنی کفیل (ضامن) ہے۔

حضرت مقاتل نے کہا: اس کا معنی شهیدا (گواہ، شاہد) ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ قبیلة کی جمع ہے، یعنی آپ ملائکہ کی اصناف در آنحالیکہ وہ قبیلہ قبیلہ ہیں انہیں لے آئیں (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ضامن ہیں یعنی وہ ہمیں آپ کے اسے لانے کی ضمانت دیں۔ اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ یعنی یا آپ کے لئے سونے کا ایک گھر ہو جائے؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے (2)۔ اور اس کا اصل معنی زینت ہے اور المزخرف کا معنی مزیّن (جس کو آراستہ کیا جائے) ہے۔ اور زخارف الماء سے مراد اس کے راستے ہیں۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: میں نہیں جانتا تھا زخرف کیا ہے یہاں تک کہ میں نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں دیکھا بیتٌ مِنۡ ذَھَبٍ (3) (سونے کا گھر) یعنی ہم اس فقر کی حالت میں جو ہم دیکھ رہے ہیں آپ کی اتباع اور پیروی نہیں کریں گے۔ اَوْ تَرْقٰى فِی السَّمَآءِ یا آپ آسمان میں چڑھیں؛ کہا جاتا ہے: رَقِیتُ فی السُّلَّمِ اَرْقَی رَقْیًا وَ رُقِیًّا جب تو سیڑھی پر چڑھے۔ اور ارتقیت بھی اسی کی مثل ہے۔ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّكَ یعنی آپ کے چڑھنے کی وجہ سے ہم ایمان نہیں لائیں گے، اور یہ مصدر ہے، جیسے مضی یمضی مُضِیًّا، اور ھوی یھوی ھُوِیًّا ہیں اسی طرح رقی یرقی رُقِیًّا ہے۔ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَیْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ یعنی یہاں تک کہ آپ الله تعالیٰ کی جانب سے ہم میں سے ہر آدمی کی طرف ایک کتاب (تحریر) اتار لائیں جسے ہم پڑھ سکتے ہوں؛ جیسا کہ الله تعالیٰ نے فرمایا: بَلْ یُرِیْدُ كُلُّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ اَنْ یُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (المدثر) (بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ ان کو کھلے صحیفے دیئے جائیں۔)

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ اہل مکہ اور شام نے قال سبحان ربی پڑھا ہے یعنی قال کا فاعل حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے الله تعالیٰ کی پاکی بیان کی کہ وہ کسی شے سے عاجز ہو اور اس سے کہ اس پر کوئی کام پیش کیا جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ سارے کا سارا کلام ان کے کفر اور ان کی خواہشات میں افراط کے سبب اظہار تعجب کے لئے ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ امر کی بنا پر قُلْ پڑھا ہے: یعنی آپ انہیں فرمادیں اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم۔ هَلْ كُنْتُ یعنی میں نہیں ہوں اِلَّا

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 186، بمفہوم 2۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 187 3۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 188

بَشَرًا رَّسُوْلًا مگر آدمی (اللہ کا) بھیجا ہوا۔ میں اس کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں میں سے جو انسان کی قدرت میں نہیں ہیں جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے، کیا تم نے انسانوں میں سے کسی کے بارے سنا ہے کہ وہ یہ نشانیاں اور آیات لایا ہو؟ اور بعض ملحدوں نے کہا ہے: یہ ایسا جواب نہیں ہے جس پر قناعت کی جائے، اور انہوں نے غلط کہا ہے، کیونکہ آپ نے انہیں جواب یہ دیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ میں ایک آدمی ہوں میں ان میں سے کسی شے پر قدرت نہیں رکھتا جو تم نے مجھ سے مطالبات کئے ہیں، اور نہ میرے لئے یہ ہے کہ میں اپنے رب پر انہیں ڈال دوں (یعنی ان کا اپنے رب سے مطالبہ کروں)، کیونکہ مجھ سے پہلے انبیاء و رسل علیہم السلام اپنی امتوں کے پاس ان تمام میں سے کوئی شے نہیں لائے جو مطالبات اور خواہشات وہ لوگ رکھتے تھے اور میرا طریقہ بھی انہیں کا طریقہ ہے، اور وہ انہیں آیات وعلامات پر اقتصار کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان علامات میں سے عطا فرمائیں جو ان کی نبوت کی صحت پر دلیل تھیں، پس جب وہ (انبیاء علیہم السلام) ان پر حجت قائم کردیں تو پھر ان کی قوم کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ان کے سوا اور کی خواہش اور مطالبہ کریں، اور اگر اللہ تعالیٰ پر واجب ہو کہ وہ انہیں ان تمام علامات کے ساتھ بھیجے جن کی وہ خواہش اور مطالبہ کرتے ہیں تو پھر اس پر یہ بھی لازم ہے کہ رسولوں میں سے وہ بھیجے جنہیں وہ اختیار اور پسند کریں گے، اور ہر آدمی کے لئے یہ کہنا لازم ہو جائے گا کہ میں ایمان نہیں لاؤں گا یہاں تک کہ اس کے خلاف نشانی لائی جائے جس کا مطالبہ میرے سوا دوسرے نے کیا ہے۔ اور یہ اس طرف لوٹ جائے گا کہ تدبیر لوگوں کے پاس ہے، (حالانکہ) بلاشبہ تدبیر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾

”اور نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے جب آئی ان کے پاس ہدایت مگر اس چیز نے کہ انہوں نے کہا کہ کیا بھیجا ہے اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کو رسول بنا کر؟ (ایسا نہیں ہو سکتا)۔“

قولہ تعالیٰ: وَ مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى یعنی جب اللہ تعالیٰ کے پاس سے اس کی طرف بلانے کے لئے رسل علیہم السلام اور کتابیں آگئیں (تو لوگوں کو ایمان لانے سے نہیں روکا) اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا مگر اس چیز نے کہ انہوں نے اپنی جہالت کے سبب کہا۔ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کا رسول انسانوں میں سے ہو، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی فرط عناد اور سرکشی کو بیان کیا کیونکہ انہوں نے کہا: آپ ہماری مثل ہیں پس آپ کی اطاعت اور پیروی ہم پر لازم نہیں، اور وہ معجزہ سے غافل ہو گئے، پس پہلا اَنْ حرف جر کے ساتھ ساقط ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اور دوسرا اَنْ منع کی وجہ سے محل رفع میں ہے (تقدیر کلام اس طرح ہے) و ما منع الناس من انْ یؤمنوا اذ جآء هم الهدى الا قولهم اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓىِٕكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

''فرمائیے: اگر ہوتے زمین میں (انسانوں کی بجائے) فرشتے جو اس پر چلتے (اور اس میں) سکونت اختیار کرتے تو ہم (ان کی ہدایت کے لئے) ان پر اتارتے آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بنا کر۔''

اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمادیا کہ فرشتے کو فرشتوں کی طرف بھیجا جاسکتا ہے، کیونکہ اگر وہ آدمیوں کی طرف فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا تو وہ اسے اس ہیئت پر دیکھنے کی قدرت نہ رکھتے جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے، اور بلاشبہ اس نے انبیا علیہم السلام کو اس پر قدرت دے رکھی ہے اور ان میں وہ چیز پیدا فرما رکھی ہے جس کے ساتھ وہ قدرت رکھتے ہیں، تاکہ یہ ان کے لئے نشانی اور معجزہ ہوجائے۔ اور اس آیت کی نظیر سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْہِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰہُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰہُ رَجُلًا (الانعام) (اور بولے کیوں نہ اتارا گیا ان پر فرشتہ اور اگر ہم اتارتے فرشتہ تو فیصلہ ہوگیا ہوتا ہر بات کا پھر نہ مہلت دی جاتی انہیں اور اگر ہم بناتے نبی کسی فرشتے کو تو بناتے اس کو انسان (کی شکل میں)) اس کے بارے پہلے بحث گزر چکی ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰہِ شَہِیْدًۢا بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ اِنَّہٗ كَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا ۝

''فرمائیے: کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان، بے شک وہ اپنے بندوں (کے احوال) کو خوب جاننے والا ہے اور ان کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔''

روایت ہے کہ کفار قریش نے جس وقت یہ قول سنا: ہَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا تو انہوں نے کہا: پس کون آپ کی شہادت دے گا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: قُلْ كَفٰى بِاللّٰہِ شَہِیْدًۢا بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ اِنَّہٗ كَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیْرًۢا بَصِیْرًا۔

وَمَنْ یَّہْدِ اللّٰہُ فَہُوَ الْمُہْتَدِ ۚ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَہُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِہٖ ؕ وَنَحْشُرُہُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰی وُجُوْہِہِمْ عُمْیًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ؕ مَاْوٰىہُمْ جَہَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰہُمْ سَعِیْرًا ۝

''اور جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کردے تو آپ نہیں پائیں گے ان (گمراہوں) کے لئے کوئی مددگار اس کے سوا اور ہم اٹھائیں گے انہیں قیامت کے روز منہ کے بل اس حال میں کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے، جب بھی سرد ہونے لگے گی (جہنم کی آگ) تو ہم ان کے لئے اس کی آنچ کو بڑھادیں گے۔''

قولہ تعالیٰ: وَمَنْ یَّہْدِ اللّٰہُ فَہُوَ الْمُہْتَدِ یعنی اگر اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت عطا فرمائے تو وہ یقیناً ہدایت یافتہ ہوجائیں۔ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَہُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِہٖ یعنی (جنہیں اللہ تعالیٰ گمراہ کردے) انہیں کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ وَنَحْشُرُہُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰی وُجُوْہِہِمْ اس میں دو وجہیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد انہیں تیزی اور

جلدی کے ساتھ جہنم کی طرف لے جاتا ہے، جیسا کہ عربوں کا قول ہے: قدم القوم علی وُجُوهِهِمْ (یہ تب بولتے ہیں) جب وہ تیزی سے چل کر آئیں۔ اور دوسرا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ انہیں قیامت کے دن چہروں کے بل جہنم کی طرف گھسیٹا جائے گا جیسا کہ دنیا میں اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے جس کو انتہائی زیادہ ذلیل ورسوا کرنا اور عذاب دینا مقصود ہو۔ اور یہی معنی صحیح ہے، کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ کسی آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، وہ لوگ جنہیں منہ کے بل اٹھایا جائے گا، کیا کافر کو اس کے منہ کے بل اٹھایا جائے گا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا وہ ذات جس نے اسے دو پاؤں پر چلایا ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ قیامت کے دن اسے منہ کے بل چلا دے۔'' جس وقت یہ خبر حضرت قتادہ تک پہنچی تو انہوں نے کہا: کیوں نہیں ہمیں اپنے رب کی عزت کی قسم! (وہ اس پر قادر ہے)۔ اسے امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا ہے (1) اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔ عُمْيًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے (2): یعنی وہ اندھے ہوں گے اس چیز سے جو انہیں خوش کر سکتی ہے، کوئی حجت اور دلیل بیان کرنے سے گونگے ہوں گے، اور اس شے سے بہرے ہوں گے جو انہیں نفع دے سکتی ہے؛ اس قول کی بنا پر ان کے حواس اپنی اس حالت پر باقی رہیں گے جس پر وہ پہلے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک انہیں اسی صفت اور کیفیت پر اٹھایا جائے گا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بیان کی ہے (3)، تا کہ اس سے ان کے عذاب میں اضافہ ہو، پھر ان کے لئے وہ جہنم میں پیدا کر دیئے جائیں گے، پس وہ دیکھنے لگیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ رَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا (الکہف: 53) (اور دیکھیں گے مجرم (جہنم کی) آگ کو اور وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں۔) اور گفتگو بھی کرنے لگیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾ (الفرقان) (تو پکاریں گے وہاں موت کو۔) اور سننے لگیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّ زَفِيْرًا ﴿۱۲﴾ (الفرقان) (تو وہ سنیں گے اس کا جوش مارنا اور چنگھاڑنا)۔ اور مقاتل بن سلیمان نے کہا ہے: جب ان کو کہا جائے گا: اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ (المومنون) (پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ)۔ تو وہ اندھے ہو جائیں گے دیکھ نہیں سکیں گے، بہرے ہو جائیں گے کچھ سنیں گے نہیں (4)، گونگے ہو جائیں گے کچھ سمجھ نہیں سکیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ اندھے ہو جائیں گے جس وقت وہ جہنم میں داخل ہوں گے اس کی سیاہی کی شدت کی وجہ سے، اور ان کا بولنا ختم ہو جائے گا جس وقت انہیں کہا جائے گا: اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾ (المومنون) اور زفیر اور شہیق ان کے سننے کی قوت ختم کر دے گی اور پھر وہ کوئی شے نہ سن سکیں گے۔

مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ یعنی ان کا ٹھکانا اور ان کا مقام جہنم ہے۔ كُلَّمَا خَبَتْ جب بھی آگ ساکن (سرد) ہونے لگے گی (5)؛ یہ حضرت ضحاک وغیرہ سے مروی ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب آگ بجھنے لگے گی۔ کہا جاتا ہے: خبت النار تخبو خبوا أی طفئت (آگ بجھ گئی)، واخبیتها انا (اور میں نے اسے بجھا دیا) زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (تو ہم ان کے لئے اس کی آنچ کو

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ اسراء، جلد 2، صفحہ 701
2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 193
3۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 531
4۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 275
5۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 195

بڑھادیں گے) یعنی وہ آگ شعلے مارنے لگے گی۔ اور اس کے شعلوں کا ساکن ہونا، کم ہونا ان کی اذیت اور درد میں کمی کے بغیر ہوگا اور اس سے ان کے عذاب میں کوئی تخفیف نہ ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آگ سرد ہونے کے قریب ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ (النحل: 98) (اور جب تو قرآن کریم پڑھنے کا ارادہ کرے)، (تو اسی طرح جب وہ آگ سرد ہونے کا ارادہ کرے گی تو اسے اور بڑھا دیا جائے گا)۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ قَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۹۹﴾

"یہ سزا ہے ان کی کیونکہ انہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم اٹھائے جائیں گے از سر نو پیدا کر کے؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ جس نے پیدا فرمایا ہے آسمانوں اور زمین کو وہ اس پر بھی قادر ہے کہ پیدا فرمادے ان کی مثل اور اس نے مقرر فرمادی ہے ان کے لئے ایک میعاد جس میں ذرا شک نہیں، پس انکار کر دیا ظالموں نے (اللہ کی قدرت کا) سوائے اس کے کہ وہ ناشکری کریں۔"

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا یعنی وہ عذاب ان کے کفر کی جزا ہے۔ وَ قَالُوْۤا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا ءَ (کیا جب ہم ہڈیاں اور) مٹی ہو جائیں گے۔ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا پس انہوں نے دوبارہ اٹھائے جانے (زندہ کئے جانے) کا انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جواب دیا اور فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَ جَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ کہا گیا ہے کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، ای أولم یروا أن اللہ الذی خلق السموات والأرض، وجعل لھم أجلا لا ریب فیہ قادر علی أن یخلق مثلھم (کیا انہوں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا ہے اور اس نے ان کے لئے ایک میعاد مقرر فرمادی ہے جس میں ذرا شک نہیں وہ ان کی مثل پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔) اور الأجل سے مراد دنیا میں ان کے قیام کی مدت اور پھر ان کی موت ہے، اور یہ وہ ہے جس میں کوئی شک نہیں کیونکہ اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کے اس قول کا جواب ہے: اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قیامت کا دن ہے۔ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا یعنی مشرکوں نے انکار کر دیا (اللہ تعالیٰ کی قدرت کا) سوائے اس مدت اور اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرنے کے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ مقررہ مدت وہی اٹھائے جانے کا وقت ہے، اور اس میں شک نہیں کیا جانا چاہیے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَ كَانَ

الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾

”فرمایئے: اگر تم مالک ہوتے میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے تو اس وقت تم ضرور ہاتھ روک لیتے اس خوف سے کہ کہیں (سارے خزانے) ختم ہی نہ ہو جائیں، واقعی انسان بڑا تنگدل ہے۔“

قولہ تعالیٰ: قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْٓ یعنی اگر تم رزق کے خزانوں کے مالک ہوتے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اگر تم نعمتوں کے خزانوں کے مالک ہوتے، اور یہ اعم ہے۔ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ تو تم بخل کے سبب ضرور ہاتھ روک لیتے، اور یہ ان کے اس قول کا جواب ہے: لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ (الاسراء) یہاں تک کہ ہم معیشت میں خوشحال اور وسیع ہو جائیں، یعنی اگر تم خوشحال ہو بھی جاؤ تب بھی ضرور بخل کرو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اگر مخلوق میں سے کوئی ایک اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا مالک بن جائے تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے سخاوت کرنے کی طرح ان کے ساتھ سخاوت نہ کرے؛ اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ ہے...... کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سے اپنے خرچ اور اپنی منفعت کے حصول کے لیے ہاتھ روک لے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے...... کہ اسے فقر و افلاس کا خوف ہو اور ختم ہونے کا ڈر لاحق ہو جائے (لہٰذا وہ ہاتھ روک لے)۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے وجود میں ان دونوں حالتوں سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ اور اس آیت میں انفاق بمعنی فقر ہے؛ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے(1)۔ اور اہل لغت نے انفق، أصرم، أعدم اور اقتر سبھی کو مال کم ہونے کے معنی میں بیان کیا ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ اور واقعی انسان بخیل اور تنگ دل ہے۔ کہا جاتا ہے: قَتَرَ علی عیالہ یَقْتُرُ و یَقْتِرُ قَتْرًا و قُتُوْرًا جب آدمی اہل و عیال پر نفقہ (خرچہ) تنگ کر دے (تو مذکورہ جملہ کہا جاتا ہے)، اور اسی طرح التقتیر اور الاقتار ہیں، اور یہ تینوں لغات ہیں۔ اور اس آیت کے بارے میں دو مختلف قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ صرف مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ عام ہے، اور یہ جمہور کا قول ہے؛ اور اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے(2)۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾

”اور ہم نے عطا فرمائی تھیں موسیٰ (علیہ السلام) کو نو روشن نشانیاں آپ خود پوچھ لیں بنی اسرائیل سے جب موسیٰ آئے تھے ان کے پاس، پس فرعون نے آپ کو کہا: اے موسیٰ! میں تمہارے متعلق خیال کرتا ہوں کہ تم پر جادو کر دیا گیا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ان آیات میں اختلاف ہے، پس یہ کہا گیا ہے کہ یہ کتاب کی آیات کے معنی میں ہیں، جیسا کہ ترمذی اور نسائی نے صفوان بن عسال مرادی سے روایت کیا ہے کہ دو یہودی تھے ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو کہا: ہمارے ساتھ چلو اس نبی کے پاس ہم اس سے کچھ سوال کرتے ہیں، تو اس نے کہا: تو اسے نبی نہ کہہ

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 196 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 276

کیونکہ اگر اس نے ہمیں سن لیا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی وہ بہت زیادہ خوش ہو جائے گا)، پس وہ دونوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے آپ سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے پوچھا: وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، نہ زنا کرو، حق کے سوا کسی ایسے نفس کو قتل نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، اور کسی بری الذمہ آدمی کو حاکم کی طرف لے کر نہ چلو کہ وہ اسے قتل کر دے، سود نہ کھاؤ، کسی پاکدامن عورت پر تہمت اور بہتان نہ لگاؤ اور میدان جہاد میں لشکر سے نہ بھاگو شعبہ کو شک ہے اے گروہ یہود! تم پر خاص طور پر یہ لازم ہے کہ ہفتہ کے دن حد سے تجاوز نہ کرو۔'' پس ان دونوں نے آپ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسے دیئے اور کہا: ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں۔ فرمایا: ''کون سی چیز تم دونوں کو روک رہی ہے کہ تم اسلام لے آؤ۔'' ان دونوں نے کہا: بے شک حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ ان کی اولاد میں مسلسل نبی رہے اور بلاشبہ ہم ڈرتے ہیں کہ اگر ہم اسلام لے آئے تو یہودی ہمیں قتل کر دیں گے۔ ابو عیسیٰ نے کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے(1)۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیات سے مراد معجزات اور دلائل ہیں۔ حضرت ابن عباس اور ضحاک نے کہا ہے: نو نشانیاں یہ ہیں عصا مبارک، حضرت موسیٰ علیہ السلام، لسان، سمندر، طوفان، مکڑی، قمل (جوئیں) مینڈک اور خون؛ یہ مفصل علامات اور نشانیاں ہیں (2)۔ حسن اور شعبی نے کہا ہے: پانچ سورۃ الاعراف میں مذکور ہیں، یعنی طوفان اور جو اس پر معطوف ہے، ید بیضاء، عصا، قحط سالی اور پھلوں میں نقصان اور کمی۔ اور اسی طرح حسن سے مروی ہے، مگر یہ قحط سالی اور پھلوں میں کمی کو ایک بناتے ہیں (3)، اور نویں علامت عصا مبارک کا پھینکی جانے والی رسیوں کو (جھوٹ کے سانپ) جلدی سے نگل جانے کو قرار دیتے ہیں، اور اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، مگر یہ کہ انہوں نے قحط سالی اور پھلوں میں نقصان کی جگہ سمندر اور پہاڑ کو رکھا ہے۔ اور محمد بن کعب نے کہا ہے: یہ وہی پانچ ہیں جو سورۃ الاعراف میں ہیں اور سمندر، عصا، پتھر، اور ان کے مالوں کو مٹا دینا۔ ان آیات کی مکمل شرح پہلے گزر چکی ہے والحمدللہ۔

فَسْـَٔلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ یعنی اے محمد! آپ ان سے پوچھئے جب موسیٰ علیہ السلام ان نشانیوں اور علامات کے ساتھ ان کے پاس آئے، جیسا کہ اس کا بیان سورۂ یونس میں گزر چکا ہے۔ اور یہ سوال برائے استفہام ہے تاکہ یہودی اس کی صحت کو جان لیں جو کچھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ رہے ہیں۔ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا یعنی آپ تو اپنے افعال کی ندرت اور غرابت کے ساتھ جادو کرنے والے ہیں، یہ فراء اور ابو عبیدہ نے کہا ہے۔ پس اس میں مفعول کو فاعل کی جگہ رکھا گیا ہے، جیسے تو کہتا ہے: هذا مشئوم و میمون، ای شائم و یامن (یہ نحوست ڈالنے والا، اور یہ مبارک بنانے والا ہے)، (یعنی اس میں مفعول کو فاعل کی جگہ رکھا گیا ہے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی مخدوعا (جس کو دھوکہ دیا گیا ہو۔) اور

1۔ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، سورۂ بنی اسرائیل، جلد 2، صفحہ 142۔ ایضاً، باب فی قبلۃ الید والرجل، حدیث 2657، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 197

3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 277

یہ قول بھی ہے کہ یہ بمعنی مغلوباً ہے (جس پر غلبہ پا لیا گیا ہو)؛ یہ مقاتل نے کہا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں، اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو نہیک سے روایت ہے کہ ان دونوں نے اسے: فَسَالَ بَنِیْ اسرائیل خبر کی صورت میں پڑھا ہے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کر دے اور ان کا راستہ چھوڑ دے اور وہ انہیں آپ کے ساتھ بھیج دے۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾

"کلیم نے جواباً فرمایا: (اے فرعون!) تو خوب جانتا ہے کہ نہیں اتارا ان نشانیوں کو مگر آسمانوں اور زمین کے رب نے یہ بصیرت افروز ہیں۔ اور اے فرعون! میں تیرے متعلق یہ خیال کرتا ہوں کہ تو ہلاک کر دیا جائے گا۔"

قولہ تعالیٰ: قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ یعنی اے فرعون! تو ان نو نشانیوں کو خوب جانتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہی نازل کیا ہے۔ اس میں انزل بمعنی أوجد (ایجاد کرنا) ہے۔ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ یعنی یہ ایسی دلالات ہیں جن سے اس کی قدرت اور اس کی وحدانیت پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اور قرأت عامہ عَلِمْتَ تا کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور یہ خطاب فرعون کو ہے۔ اور کسائی نے تا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے، اور فرمایا: قسم بخدا! اللہ تعالیٰ کے دشمن نے نہیں جانا لیکن موسیٰ علیہ السلام وہ ہیں جنہیں اس کا علم ہوا، پس یہ خبر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا: بلاشبہ یہ لَقَدْ عَلِمْتَ ہے، اور آپ نے اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کیا ہے: وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (النمل: 14) (1) (اور انہوں نے انکار کر دیا ان کا حالانکہ یقین کر لیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے (ان کا انکار) محض ظلم اور تکبر کے باعث تھا۔) اور فرعون کی نسبت عناد اور سرکشی کی طرف کی۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: اس سے جو معنی لیا گیا ہے ہمارے نزدیک اس میں تا کا فتحہ ہے، اور وہی اصح ہے اس معنی کی وجہ سے جس سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے استدلال کیا ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اپنے قول علمت انا کے ساتھ استدلال نہیں کرتے، اور آپ تو دعوت دینے والے رسول ہیں، اس تمام کے باوجود اگر یہ قرأت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح ہوتی تو یقیناً حجت ہوتی، لیکن یہ آپ سے ثابت نہیں ہے، بلکہ یہ تو کلثوم مرادی سے مروی ہے اور وہ مجہول ہے اس کی کوئی پہچان نہیں ہے، اور ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے کسائی کے بغیر اس طرح پڑھا ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان معجزات کے بارے جاننے کی نسبت فرعون کی طرف کی ہے) کیونکہ فرعون اس مقدار کو جانتا تھا جس کا کرنا جادوگروں کے لئے ممکن تھا، اور اس کی مثل جو موسیٰ علیہ السلام نے کیا کسی جادوگر کے لئے ممکن نہیں، اور یہ کہ کوئی اس کے کرنے پر قدرت نہیں رکھتا مگر وہی جو اجسام بناتا ہے اور آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ایک سرد اور ٹھنڈے دن میں داخل ہوئے اور وہ اپنے اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھا، پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 201

اپنا عصا مبارک ڈال دیا تو وہ اژدھا بن گیا، پس فرعون نے گھر کی دونوں اطراف کو اس کے جبڑوں کے درمیان دیکھا، تو وہ خوفزدہ ہو گیا اور اپنی چادر میں داخل ہو گیا۔ [اللُقم ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی جبڑا ہے، اور حدیث میں ہے من حفظ ما بین لقمیه (1) (یعنی جس نے اس کی حفاظت کی جو اس کے دو جبڑوں کے درمیان ہے (مراد زبان ہے)] وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا۝ یہاں ظن بمعنی تحقیق ہے۔ اور الثبور کا معنی ہلاکت اور خسران (نقصان اٹھانا) بھی ہے۔

کمیت نے کہا ہے:

ورأتْ قُضاعة فی الأیا مِن رأیٔ مثبورٍ و ثابر

ای مخسور و خاسر (یعنی جس کو خسارہ دیا گیا اور نقصان اٹھانے والا) یعنی یمن کی طرف اپنی نسبت کرنے میں (خسارے میں ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ملعون (جس پر لعنت کی گئی ہو) ہے۔ اسے منہال نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (2)۔ اور یہ اَبان بن تغلب نے کہا ہے۔

اور یہ شعر بھی کہا ہے:

یا قومنا لا تَرُوموا حَرْبَنَا سَفَهًا اِنَّ السَّفاہ وإن البَغْیَ مثبورُ

اس میں مثبور بمعنی ملعون ہے۔ اور میمون بن مہران نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: کہ مَثْبُوْرًا سے مراد ناقص العقل ہے۔ اور مامون نے ایک آدمی کو دیکھا اور اس کو کہا: اے مثبور! تو اس سے اس بارے پوچھا گیا، اس نے جواب دیا: رشید نے کہا ہے کہ منصور نے ایک آدمی کو کہا: مثبور، تو میں نے اس سے اس کے بارے پوچھا تو اس نے کہا: مجھے میمون بن مہران نے بیان کیا ہے۔۔۔ اور اس نے اس کا ذکر کیا۔ اور حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ اس کا معنی ''ہلاک کیا گیا'' ہے (3)۔ اور الثبور کا معنی ہلاکت ہے، کہا جاتا ہے: ثبر اللہ العدو ثبورًا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے دشمن کو ہلاک کر دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے جس کو خیر سے روک دیا جائے۔ اہل لغت نے بیان کیا ہے: ما ثبرك عن كذا یعنی تجھے اس سے کس نے منع کیا ہے۔ اور ثبرہ اللہ ثبرہ [ویثبِرہ یہ دونوں لغتیں ہیں]۔

ابن الزبعری نے کہا ہے:

اذ أجارِی الشیطان فی سنَن الغَیِّ و من مال مَیْلَه مثبور (4)

حضرت ضحاک نے کہا ہے: مَثْبُوْرًا بمعنی مسحورًا (جس پر جادو کر دیا گیا ہو) ہے۔ اختلاف الفاظ کے ساتھ اس کی مثل جو کسی نے کہا یہ اس کا جواب ہے۔ اور ابن زید نے کہا ہے: مَثْبُوْرًا اس کا معنی مخبول ہے (5) جس کی کوئی عقل نہ ہو۔

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا۝ وَّ قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا۝

1۔ المستدرک للحاکم، کتاب الحدود، جلد 4، صفحہ 399، حدیث 8063 2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 202 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 201 5۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 489

''پس اس نے ارادہ کرلیا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے اکھاڑ کر پھینک دے، سو ہم نے غرق کردیا اسے اور اس کے سارے ساتھیوں کو، اور ہم نے حکم دیا فرعون کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو کہ تم آباد ہو جاؤ اس سرزمین میں پس جب آئے گا آخرت کا وعدہ تو ہم لے آئیں گے تمہیں سمیٹ کر''۔

قولہ تعالیٰ: فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یعنی فرعون نے ارادہ کیا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو مصر کی زمین سے نکال دے یا قتل کر کے یا وہاں سے دور نکال کر، تو اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک کردیا۔ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ اور ہم نے حکم دیا اسے غرق کرنے کے بعد۔ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ بنی اسرائیل کو کہ تم شام اور مصر کی زمین میں آباد ہو جاؤ۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ پس جب قیامت کا وعدہ آئے گا۔ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا تو ہم تمہیں تمہاری قبروں سے لے آئیں گے اس حال میں کہ ہر جگہ سے اکٹھے ہو گے، تحقیق مومن کافر کے ساتھ مل جائے گا اور ایک دوسرے کی پہچان نہیں کر سکیں گے، اور تم میں سے کوئی بھی اپنے قبیلہ اور اپنے محلہ کی طرف مائل نہ ہوگا۔ اور حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ نے کہا ہے (1): ہم مختلف جہتوں سے تمہیں اکٹھا کر کے لے آئیں گے۔ دونوں معنی ایک ہی ہیں۔ جوہری نے کہا ہے: اللفیف سے مراد لوگوں کا متفرق قبائل سے اکٹھا اور جمع ہونا ہے؛ کہا جاتا ہے: جاء القوم بلفّهم و لفیفهم، یعنی قوم مل جل کر آئی۔ اور قول باری تعالیٰ: جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا یعنی ہم تمہیں اکٹھا کر کے اور ملا جلا کر لے آئیں گے۔ اور طعام لفیف جب کھانا دو یا زیادہ جنسوں سے ملا جلا اور مخلوط ہو۔ اور فلان لفیف فلان یعنی فلاں فلاں کا دوست ہے۔ اصمعی نے کہا ہے: اللفیف جمع ہے اور اس کی واحد نہیں ہے، اور یہ جمیع کی مثل ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ انہیں قبروں سے اٹھاتے وقت منتشر مکڑیوں کی طرح نکالا جائے گا، درآنحالیکہ وہ اس طرح ملے جلے ہوں گے کہ ایک دوسرے کی پہچان نہیں کر سکیں گے۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے اترنے کا وقت آجائے گا۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۞

''اور حق کے ساتھ ہی ہم نے اسے اتارا ہے اور حق کے ساتھ ہی وہ اترا ہے، اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر (رحمت الٰہی کا) مژدہ سنانے والا اور (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا''

قولہ تعالیٰ: وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ یہ آیت سابقہ معجزات اور قرآن کے ذکر کے ساتھ متصل ہے۔ اور ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ: وَبِالْحَقِّ نَزَلَ میں تکرار کی وجہ یہ ہے کہ یہ ممکن ہے پہلے کا معنی ہو، ہم نے اسے حق کے ساتھ اتارنے کو واجب کیا ہے۔ اور دوسرے کا معنی ہو: اور یہ نازل ہوا اور اس میں حق ہے، جیسا کہ یہ قول ہے: خرج بثیابه (فلاں اپنے کپڑوں کے ساتھ نکلا) یعنی و علیه ثیابه (اور اس پر اس کے کپڑے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: پہلے وَبِالْحَقِّ میں با بمعنی مع ہے یعنی حق کے ساتھ، جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: رکب الامیر بسیفه ای مع سیفه (حاکم اپنی تلوار سمیت سوار ہوا) وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ای بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا، جیسا کہ تو کہتا ہے: نزلت بزید (میں زید کے

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 278

پاس اترا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی ہو و بالحق قدرنا ان ینزل (حق کے ساتھ ہم نے فیصلہ کیا کہ وہ نازل ہو)، اور اسی طرح نزل بھی ہے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾

''اور قرآن کو ہم نے جدا جدا کر کے نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ سیبویہ کا مذہب ہے کہ قُرْاٰنًا فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے جس کی تفسیر ظاہر فعل کر رہا ہے۔ اور جمہور لوگوں نے فَرَقْنٰهُ را کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور اس کا معنی ہے ہم نے اسے بیان کیا ہے اور ہم نے اس کی وضاحت کر دی ہے، اور ہم نے اس میں حق اور باطل کے درمیان فرق کیا ہے؛ یہ حسن نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ہم نے اسے مفصل بیان کیا ہے(1)۔ اور حضرت ابن عباس، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت قتادہ، ابو رجاء، اور شعبی رضی اللہ عنہم نے فَرَّقْنٰهُ تشدید کے ساتھ پڑھا ہے(2)، یعنی ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا نہ کہ یکبارگی، مگر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں اور حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی قرأت میں فرقناہ علیک ہے۔ اور اس میں اختلاف ہے کہ قرآن کریم کتنی مدت میں نازل ہوا، پس کہا گیا ہے کہ پچیس برس میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تیئیس برس میں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: بیس برس میں نازل ہوا۔ اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر میں اختلاف کی وجہ سے ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ آسمان دنیا کی جانب سارا ایک ہی بار نازل ہوا۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

عَلٰى مُكْثٍ یعنی طویل مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کے مطابق یہ قرآن ترتیب وار نازل ہوتا رہا یعنی ہم نے اسے ایک ایک آیت کر کے اور ایک ایک سورت کر کے نازل کیا۔ اور رہا پہلا قول تو اس کے مطابق عَلٰى مُكْثٍ کا معنی ہوگا تلاوت اور ترتیل میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں؛ یہ حضرت مجاہد، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ پس قاری کو چاہئے کہ وہ قرأت میں اس کا حق ادا کرے اس طرح کہ وہ اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور حسن آواز کے ساتھ بغیر تلحین اور ایسی سر اور ترنم کے جو زیادتی یا کمی کے ساتھ قرآن کے الفاظ کو تبدیل کر دے کیونکہ یہ حرام ہے جیسا کہ کتاب کے شروع میں گزر چکا ہے، جہاں تک ممکن ہو وہ اسے حسین اور عمدہ بنائے۔ اور قراء نے ابن محیصن کے بغیر مُکث میں میم کے ضمہ پر اجماع کیا ہے اور ابن محیصن نے میم پر فتحہ پڑھا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: مَکْث و مُکث اور مِکث؛ یہ تینوں لغات ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: عَلٰى مُكْثٍ یعنی خوب تثبت اور ٹھہراؤ کے ساتھ۔ قولہ تعالیٰ: وَنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا یہ مصدر کے ساتھ سابقہ معنی میں مبالغہ اور تاکید پیدا کرتا ہے، یعنی ہم نے اسے یکے بعد دیگرے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا، اگر وہ تمام فرائض کو ایک ہی وقت میں لے لیتے تو وہ یقیناً متنفر ہو جاتے اور بھاگ جاتے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 205 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 490

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾

''آپ (کفار کو) کہیے: خواہ تم ایمان لاؤ اس پر یا نہ ایمان لاؤ، بے شک وہ لوگ جنہیں دیا گیا ہے علم اس سے پہلے جب اسے پڑھا جاتا ہے ان کے سامنے تو وہ گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے''۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا یعنی قرآن کریم کے ساتھ تم ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے لئے بطور تبکیت اور تہدید ہے نہ کہ بطور تخییر ہے (یعنی یہ انہیں ایمان لانے یا نہ لانے کا اختیار نہیں دیا جا رہا بلکہ انہیں جھڑکا جا رہا ہے۔) اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ بے شک وہ لوگ جنہیں قرآن کریم کے نازل ہونے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے علم دیا گیا ہے، اور وہ اہل کتاب ایمان لانے والے ہیں؛ یہ ابن جریج وغیرہ کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ کا معنی ہے جب ان کی کتاب پڑھی جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب قرآن کریم ان پر پڑھا جاتا ہے۔ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا اور کہا گیا ہے: یہ اولاد اسماعیل علیہ السلام میں سے ایک قوم ہے انہوں نے دین کو مضبوطی سے تھامے رکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، ان میں سے زید بن عمرو بن نفیل اور ورقہ بن نوفل ہیں۔ اور اس معنی کی بنا پر مراد وہ نہیں جنہیں کتاب دی گئی بلکہ مراد وہ ہیں جنہیں علم دین عطا کیا گیا۔ اور حسن نے کہا ہے: وہ جنہیں علم عطا فرمایا گیا وہ حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: بے شک یہ یہود کے کچھ لوگ تھے (1)، اور قول باری تعالیٰ مِنْ قَبْلِهٖۤ سے یہی ظاہر ہے۔ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق جب ان پر قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔ جب وہ اسے سنتے جو قرآن کریم اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے تو وہ سجدہ میں گر جاتے اور کہتے: سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا اور یہ بھی کہا گیا ہے: جب وہ اپنی کتاب اور اس قرآن کی تلاوت کرتے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے تو وہ خشوع کرتے، سجدے کرتے اور تسبیح بیان کرتے، اور کہتے: یہ وہی ہے جو تورات میں مذکور ہے، اور یہی اس کی صفت اور انداز ہے، اور لامحالہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ واقع اور پورا ہونے والا ہے، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہو گئے، پس انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور ایک جماعت نے کہا ہے: الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ سے مراد حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (2)، اور قَبْلِهٖۤ کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے جیسا کہ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ میں ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: دونوں ضمیریں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہیں، اور نئے سرے سے قرآن کریم کا ذکر اس قول باری تعالیٰ میں ہے: اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ۔ (3)

وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾

''اور کہتے ہیں: (ہر عیب اور نقص سے) پاک ہے ہمارا رب، بلاشبہ ہمارے رب کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے''۔

یہ سجود میں تسبیح کے جواز پر دلیل ہے۔ اور صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

1۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 280 2۔ ایضاً 3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 491

رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رکوع اور سجود میں کثرت سے یہ کہتے تھے: سبحانك اللّٰھم [ربنا] و بحمدك اللّٰھم اغفرلی(1) (تیری ذات پاک ہے اے اللہ [اے ہمارے رب] اور حمد تیرے ہی لئے ہے اے اللہ! میری مغفرت فرما۔)

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾

''اور گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل گریہ وزاری کرتے ہوئے اور یہ قرآن ان کے (خضوع و) خشوع کو بڑھا دیتا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ یہ ان کی صفت کے بیان میں مبالغہ اور ان کی مدح ہے۔ اور ہر وہ آدمی جس کی پہچان علم کے ساتھ ہے اور اس نے اس سے کچھ حاصل کیا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس مرتبہ پر فائز ہو، اور وہ قرآن کریم کے سماع کے وقت خشوع، تواضع اور عاجزی کا اظہار کرے۔ اور مسند دارمی ابو محمد میں تیمی سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: جسے علم عطا کیا گیا جس نے اسے نہ رلایا تو زیادہ لائق اور مناسب ہے کہ اسے علم عطا نہ ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء کی صفت یہ بیان فرمائی ہے، پھر یہی آیت تلاوت کی۔ اسے علامہ طبری نے بھی ذکر کیا ہے(2)۔ اور الاذقان، ذقن کی جمع ہے، اور یہ دو جبڑوں کو مجتمع ہے۔ اور حسن نے کہا ہے: الْاَذْقَان یہ ڈاڑھی سے عبارت ہے(3)، یعنی وہ اسے سجدہ کی حالت میں زمین پر رکھ دیتے ہیں، اور یہ حد درجہ تواضع ہے۔ اور اس میں لام بمعنی علی ہے؛ آپ کہتے ہیں: سقط لِفیه ای علی فیه (وہ منہ کے بل گرا)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا یعنی وہ مونہوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں(4) اور اذقان (ٹھوڑیوں) کو خاص طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ ٹھوڑی انسان کے منہ سے قریب ترشے ہے۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: ٹھوڑی پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہوتا، کیونکہ یہاں ذقن سے مراد الوجہ (چہرہ) ہے، اور کبھی ایک شے کو اپنے مجاور (پڑوس والی شے) سے اور کل کو بعض کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، پس کہا جاتا ہے: خرّ لوجهه ساجدا (وہ اپنے چہرے کے بل سجدے میں گر گیا) اگرچہ اس نے اپنے رخساروں اور اپنی آنکھوں پر سجدہ نہیں کیا۔ کیا تو اس قول کی طرف نہیں دیکھتا۔)

فخرّ صَرِيعا لليدين و لِلفَم

تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے منہ اور ہاتھوں کے بل گر پڑا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: يَبْكُوْنَ حالت نماز میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے کے جائز ہونے پر دلیل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے دین میں اپنی معصیت پر رونے کے جواز پر دلیل ہے، اور یہ کہ یہ نہ نماز کو توڑتا ہے اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچاتا ہے۔ حضرت ابن مبارک نے حماد بن سلمہ سے انہوں نے ثابت بنانی سے انہوں نے مطرف بن عبداللہ بن شخیر سے اور انہوں نے اپنے باپ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اس حال میں کہ آپ نماز

1۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، مایقول فی الرکوع والسجود، جلد 1، صفحہ 192
2۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 209
3۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 208
4۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 208-207

پڑھ رہے تھے اور رونے کے سبب آپ کے پیٹ میں اس طرح کھولنے کی آواز آ رہی تھی جیسے ہانڈی کے کھولنے کی آواز آتی ہے۔ اور ابوداؤد کی کتاب میں ہے: رونے کے سبب آپ کے سینے میں اس طرح کی آواز تھی جیسے چکی کی آواز ہوتی ہے(1)۔

مسئلہ نمبر 3۔ کراہنے کے بارے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے، پس امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: کراہنا مریض کی نماز کو نہیں توڑتا، اور آپ نے صحت مند آدمی کے لئے کراہنا مکروہ قرار دیا ہے؛ اور یہی ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ اور ابن الحکم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے: کھانسنا، کراہنا اور پھونک مارنا نماز کو نہیں توڑتا۔ اور ابن القاسم نے کہا ہے: اسے توڑ دیتا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اگر اس کے حروف ہوں جو سنے اور سمجھے جا سکتے ہوں تو نماز ٹوٹ جائے گی۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: اگر اس کا کراہنا اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہو تو نماز نہیں ٹوٹے گی، اور اگر درد کی وجہ سے ہو تو نماز کو توڑ دیتا ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اس کی نماز ان تمام صورتوں میں مکمل ہے؛ کیونکہ کوئی مریض اور ضعیف آدمی کراہنے سے خالی نہیں ہوتا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا خشوع کے بارے میں گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے اور مزید آگے آئے گی۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝۱۱۰

''آپ فرمایئے: یا اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے اسے پکارو اس کے سارے نام (ہی) اچھے ہیں اور نہ تو بلند آواز سے نماز پڑھو اور نہ بالکل آہستہ پڑھو اسے اور تلاش کرو ان دونوں کے درمیان (معتدل) راستہ۔''

قولہ تعالیٰ: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا اللہ یا رحمٰن پکارتے ہوئے سنا تو کہنے لگے: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں تو ایک الٰہ کو پکارنے کا حکم دیتے ہیں اور خود دو کو پکارتے ہیں؛ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے۔ اور مکحول نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات تہجد کی نماز پڑھی اور اپنی دعا میں یہ کہا: یا رحمٰن یا رحیم (2) اور مشرکین میں سے ایک آدمی نے اسے سن لیا۔ اور یمامہ کا ایک آدمی تھا جس کا نام رحمٰن تھا، تو اس سننے والے نے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ یمامہ کے رحمٰن کو پکار رہے ہیں؟ پس یہ آیت یہ بیان کرنے کے لئے نازل ہوئی کہ یہ دونوں اسم ایک مسمی کے ہیں، پس اگر تم نے اسے یا اللہ کے ساتھ پکارا تو وہ بھی ذات ہے اور اگر تم نے اسے یا رحمٰن کے ساتھ پکارا تو بھی وہی ذات مراد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ تحریر کے شروع میں لکھتے تھے: باسمک اللھم؛ پھر یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ (النمل) تب رسول اللہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، البکاء فی الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 130۔ ایضاً، باب البکاء فی الصلوٰۃ، حدیث 769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 492

صلی اللہ علیہ وسلم نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھا تو مشرکوں نے کہا: اس رحیم کو تو ہم پہچانتے ہیں تو یہ رحمن کون ہے، پس یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک یہودیوں نے کہا: کیا ہے ہمیں کہ ہم قرآن کریم میں ایک اسم نہیں سنتے حالانکہ وہ تورات میں کثیر ہے۔ اور ان کی مراد رحمن ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اور طلحہ بن مصرف نے اَیًّا مَّنْ تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى قرأت کی ہے، یعنی اسماء، جو افضل اوصاف اور اشرف معانی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اور اسماء کا حسین ہونا شرع کی تحسین کی طرف متوجہ کرتا ہے، کیونکہ یہ آیت مطلق ہے اور اس پر نص ہے۔ اور اس کی طرف منسوب ہونا شریف اور خوبصورت معانی کا تقاضا کرتا ہے، اور یہ توقیف کے ساتھ ہے قرآن کریم یا حدیث یا اجماع کی توقیف کے بغیر محض نظر و فکر سے اللہ تعالیٰ کا کوئی اسم وضع کرنا صحیح نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے اسے ''الکتاب الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنٰی'' میں بیان کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اس کے سبب نزول میں پانچ مختلف اقوال ہیں:

(۱) ایک وہ قول ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قول باری تعالیٰ: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا کے بارے بیان کیا ہے، انہوں نے فرمایا: یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں روپوش تھے، اور جب اپنے اصحاب کو نماز پڑھاتے تو بلند آواز سے قرآن کریم پڑھتے، اور جب مشرکین نے اسے سنا تو انہوں نے قرآن کریم، جس نے اسے نازل کیا اور جو اسے لے کر آیا تمام کے لئے غلیظ الفاظ استعمال کئے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ (اور بلند آواز سے نماز نہ پڑھو) کہ مشرک آپ کی قرأت سنیں۔ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا اور نہ اپنے اصحاب سے اسے چھپاؤ، یعنی آپ انہیں قرآن سنائیں اور بہت زیادہ آواز بلند نہ کریں۔ وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا فرمایا: آپ بلند آواز اور بالکل آہستہ آواز کے درمیان پڑھیے (1)، اسے امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی وغیرہم نے بیان کیا ہے۔ اور یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ اور المخافتة کا معنی آواز کو پست کرنا اور ساکن ہونا ہے) میت جب ٹھنڈی ہو جائے تو کہا جاتا ہے: خفت (وہ ساکن ہو گیا)۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لم يبق إلا نَفَس خافت　و مُقْلَةٌ إنسانها باهت

رَثّ لها الشامت مما بها　يا وَيْحَ مَنْ يَرْثِي له الشامت

(۲) دوسرا وہ قول ہے جو امام مسلم نے ہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے قول باری تعالیٰ: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا کے بارے میں نقل کیا ہے ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یہ آیت دعا کے بارے میں نازل فرمائی ہے (2)۔

(۳) ابن سیرین نے کہا ہے: اعرابی لوگ اپنے تشہد بلند آواز سے پڑھتے تھے تو اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بنا پر یہ آیت تشہد کو مخفی پڑھنے کو متضمن ہوگی، حالانکہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تشہد کو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 183۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب و من سورۃ بنی اسرائیل، حدیث 3071، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، التوسط فی القراءۃ فی الصلوٰۃ الجهریۃ، جلد 1، صفحہ 183　3۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 492

مخفی پڑھنا سنت سے ثابت ہے؛ اسے ابن منذر نے ذکر کیا ہے۔

(۴) یہ بھی حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آہستہ آواز سے قرآن پڑھتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بلند آواز سے پڑھتے تھے، تو اس بارے میں دونوں سے پوچھا گیا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: بلاشبہ میں اپنے رب کی مناجات کرتا ہوں، اور وہ میری حاجت کو خوب جانتا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں شیطان کو بھگاتا ہوں اور سونے والوں کو بیدار کرتا ہوں پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: تھوڑا سا آواز کو بلند کرلو، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا گیا: تم تھوڑا سا اپنی آواز کو پست کرلو؛ اسے طبری وغیرہ نے ذکر کیا ہے (1)۔

(۵) یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے آپ دن کی نماز میں بلند آواز سے قرأت نہ کریں، اور رات کی نماز میں آہستہ آواز سے قرأت نہ کریں (2)؛ اسے یحییٰ بن سلام اور زہراوی نے ذکر کیا ہے۔ پس یہ آیت نوافل اور فرائض میں قرأت بالجہر اور قرأت بالسر کے احکام کو متضمن ہے، پس رہے نوافل تو نمازی کو رات اور دن کے وقت آہستہ اور بلند آواز سے قرأت کرنے میں اختیار دیا گیا ہے، اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ دونوں امر اکٹھے کر لیتے تھے۔ اور جہاں تک فرائض کا تعلق ہے تو رات اور دن کے وقت قرأت کے بارے میں ان کا حکم معلوم ہے۔

(۶) حسن نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے تو اپنی نماز میں دکھاوا نہ کر کہ اعلانیہ میں تو انہیں خوب اچھا کرے اور سری نمازوں میں بھی تو انہیں خراب نہ کرے (3) (یعنی سری اور جہری دونوں قسم کی نمازوں میں بغیر کسی ریاکاری کے خشوع وخضوع قائم رہے اور قرأت خوب اچھی رہے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز نہ پڑھ اور نہ لوگوں کے خوف سے اسے چھوڑ۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں قرأت کو صلوٰۃ کے ساتھ تعبیر کیا ہے جیسا کہ اپنے اس ارشاد میں نماز (صلوٰۃ) کو قرأت کے ساتھ تعبیر کیا ہے: وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (الاسراء) کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے، کیونکہ نماز قرأت، رکوع اور سجود پر مشتمل ہوتی ہے پس یہ قرأت من جملہ اس کے اجزاء میں سے ہے، اور جملہ کو جز سے تعبیر کرنا اور جز کو جملہ سے تعبیر کرنا مجازاً یہ عربوں کی عادت ہے اور یہ کثیر ہے، اور اسی معنی میں صحیح حدیث بھی ہے: قسمتُ الصلواۃ بینی و بین عبدی (4) یعنی قرأت فاتحہ کو میں نے اپنے درمیان اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر دیا ہے، جیسا کہ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾

''اور آپ فرمائیے: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے نہیں بنایا (کسی کو اپنا) بیٹا اور نہیں ہے جس کا کوئی

1۔ تفسیر طبری، جلد 15، صفحہ 214 2۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 492 3۔ ایضاً

4۔ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، وجوب القراۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، جلد 1، صفحہ 170

شریک حکومت وفرمانروائی میں اور نہیں ہے اس کا کوئی مددگار درماندگی میں اور اس کی بڑائی بیان کرو کمال درجہ کی بڑائی۔"

قولہ تعالیٰ: وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا یہ آیت یہود ونصاریٰ اور عربوں کے مختلف اقوال کا رد کر رہی ہے (1): کہ حضرت عزیر، حضرت عیسیٰ اور ملائکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذریت اور اولاد ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ایسے اقوال سے پاک اور برتر ہے: وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ چونکہ وہ واحد ویکتا ہے لہٰذا اس کی حکومت اور اس کی عبادت میں کوئی شریک نہیں۔ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اس نے کسی کو حلیف نہیں بنایا اور نہ کسی کی مدد چاہی ہے، یعنی اس کا کوئی مددگار نہیں جو اسے درماندگی سے پناہ دیتا ہو کہ وہ اس کا دفاع کرنے والا ہو۔ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہود ونصاریٰ میں سے اس کا کوئی ولی اور مددگار نہیں کیونکہ وہ لوگوں میں سے ذلیل ترین ہیں (2)، (گویا) یہ ان کے اس قول کا رد ہے: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ: 18) (ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں۔) اور حسن بن فضل نے کہا ہے: وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ یعنی وہ (کمزور) اور درماندہ نہیں کہ وہ کسی ولی اور مددگار کا محتاج ہو اور نہ اس کی عزت وکبریائی کے لئے کوئی ناصر اور معاون ہے۔ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا یعنی مکمل طور پر اس کی عظمت و بڑائی بیان کرو۔ اور کہا جاتا ہے: عرب کلام میں تعظیم واجلال کے معنی میں بلیغ ترین الفاظ اللہ اکبر ہیں، یعنی اس کا وصف اس سے بیان کرو کہ وہ ہر شی سے بڑا اور عظیم ہے۔

جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

رأیتُ اللہ اکبر کل شئ محاولة و أکثرھم جنودا

میں نے یقین کیا کہ اللہ تعالیٰ از روئے قصد وارادہ کے ہر شے سے بڑا اور عظیم ہے اور از روئے لشکر کے سب سے زیادہ اور کثیر ہے۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز میں شروع ہوتے تھے تو کہتے: اللہ اکبر (3) اور یہ کتاب کے شروع میں گزر چکا ہے۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: بندے کا اللہ اکبر کہنا دنیا ومافیہا سے بہتر ہے۔ اور یہی آیت تورات کا خاتمہ ہے۔ مطرف نے عبداللہ بن کعب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا تورات کا آغاز سورۃ الانعام کے آغاز (یعنی پہلی آیت) سے ہے اور اس کا اختتام اس سورت کے خاتمہ کے ساتھ ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ یہ عزت اور غلبے والی آیت ہے: اسے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اور عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنی عبدالمطلب میں سے جب کوئی بچہ فصیح بولنے لگتا تو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 3، صفحہ 293-292 2۔ تفسیر الماوردی، جلد 3، صفحہ 282

3۔ صحیح بخاری، کتاب الاذان، رفع الیدین إذا قام من الرکعتین، جلد 1، صفحہ 102

آپ اسے یہ آیت سکھا دیتے تھے وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ الآیہ۔ اور عبد الحمید بن واصل نے کہا ہے: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: ”جس نے وَ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الآیہ پڑھی اللہ تعالیٰ اس کے لئے زمین اور پہاڑوں کی مثل اجر لکھ دے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے فرماتا ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ (مریم) (قریب ہے آسمان شق ہو جائیں اس (خرافات) سے اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے۔)

اور حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو حکم ارشاد فرمایا جس نے آپ سے قرض کے بارے شکایت کی کہ وہ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ آخر سورۃ تک پڑھے اور پھر تین بار یہ کہے۔ توکلتُ علی الحی الذی لا یموت (1)۔

1۔ تفسیر ابو اللیث، جلد 2، صفحہ 287